دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۳ ماہ شعبان المعظم ۱۴۳۵ھ مطابق ماہ جون ۲۰۱۴ء عدد ۶

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

ملک میں عام پارلیمانی انتخاب کے شور وغل کے بعد جب نتیجہ سامنے آیا تو اندیشوں کے عین مطابق وہی ظہور میں آیا جس کا خدشہ تھا، کانگریس اور اس کی حلیف پارٹیوں کا محاذ یو، پی، اے آزادی کے بعد پارلیمانی تاریخ کی سب سے بڑی شکست سے دوچار ہوا اور بی جے پی کی فتح کی لہر میں اس کی دوسری حلیف پارٹیوں کو بھی ساحل مراد مل گیا، شکست و فتح کی حقیقت کبھی مقدر سے منسوب کی جاتی تھی اور عروج و زوال کے تماش بین یہ داد دے کر راضی برضا ہو جاتے تھے کہ ع مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا، مگر اس الکشن کے نتائج کچھ اور ہی تھے، ہوسکتا ہے کہ یہ ہمارا تاثر ہو لیکن واقعہ کچھ ایسا ہی ہے کہ

تھا دیدہ حیران ہر اک زخم بدن میں انگشت تاسف تھی زباں، سب کے دہن میں

اب نتائج کے ظہور اور نئی مودی حکومت کے عروج پر فن سیاست کے ماہروں کی نظر ہے، گذشتہ حکومت کی ناکامیاں کیا تھیں؟ قیادت کا فقدان تھا یا ہمت و حوصلہ کی کمی تھی؟ یا پھر یو پی اے حکومت سے جو بن پڑا تھا، اس کی شرح نامکمل رہ گئی؟ یا یہ کام آنے کی وہ گھڑی تھی جہاں دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آگیا تھا؟ یا پھر یہ ایک مخصوص نظریہ اور فکر کی مسلسل توسیع سے صرف نظر کرنا تھا، ایک ایسا نظریہ جس کی تاریخ ہی فرقہ وارانہ منافرت، صدیوں سے ملک میں موجود مذہبی رواداری سے عداوت اور ہزاروں سال پہلے کے مبہم اور مشکوک مذہبی جذبات کے احیاء پر مشتمل ہے، کیا اس نظریہ کی خطرناکی یا زہرناکی کا بروقت ادراک نہیں کیا گیا؟ یا پھر یہ سرمایہ داروں کے حصول مال وزر کی ہوس تھی جس نے منفی سیاسی عناصر کو اپنے ارادوں کی تکمیل کے لیے بانگ دہل استعمال کیا؟ یہ بانگ دہل کیا ذرائع ابلاغ و ترسیل کی صورت تو نہیں، جنھوں نے اس قدر شوروغوغا برپا کیا اور تشہیر کا بازار ایسا گرم کیا کہ بصارتوں اور سماعتوں کے ساتھ فہم و بصیرت پر بھی پردے پڑ گئے اور آنے والے خطرات نگاہوں سے اوجھل ہو گئے؟ ملک کے آئین و دستور اور اس کے نظام پر مرتب ہونے والے اثرات کا احساس بھی نہیں رہا؟ معاشیات و اقتصادیات میں ترقی کے نعروں میں کیا زراعت اور صنعت و حرفت کی، فریاد واقعی صدائے بے اثر ہو گئی؟ یہ اور ان جیسے سوالوں کی طویل قطار ہے جو سیاست

کے نباضوں کے سامنے ہے۔ اب رموز مملکت کے خسرواں ہی اس کی پردہ دری کریں۔ ہمارا معاملہ تو یہ ہے کہ دیکھتے سب کچھ ہیں سوجھتا کچھ بھی نہیں۔ اب کون کہے کہ فرقہ پرستوں اور جارحیت پسندوں کی یہ فتح اتفاقی نہیں، انہوں نے اپنے ارادوں کو واقعہ ہے کہ کبھی مخفی بھی نہیں رکھا، سیکولر طاقتوں کو بڑے شاطرانہ انداز میں وہ مسلسل کمزور کرنے کے منصوبہ پر عمل پیرا ہیں، کانگریس پارٹی اپنی تمام کمزوریوں اور نقائص کے باوجود فرقہ پرست طاقتوں کی نظر میں ان کے عزائم کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی، اسی لیے ان طاقتوں کے سرخیل نے پوری قوت اس اظہار میں صرف کی کہ اس ملک کو کانگریس کے وجود سے صاف کردیا جائے۔ بات صاف تھی کہ سیکولرزم کے دوسرے چھوٹے بڑے دعوے داروں کے پاس کوئی تاریخ تھی نہ کوئی واضح لائحہ عمل، ان کی طاقت کو ان ہی کے ہتھیار کے ذریعہ مٹانا کہیں آسان تھا، یہ فکر جزوی طور پر ہی سہی لیکن بڑے موثر انداز میں کامیاب بھی ہوئی، جہاں یہ علاقائی سیکولر جماعتیں بچ بھی گئی ہیں وہاں یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ آیندہ یہ یوں ہی محفوظ رہ سکیں گی، یہ سب اپنی جگہ لیکن ماتم تو اس قوم کا ہے جس کی اس سادگی کا رونا آج سے نہیں، صدیوں سے ہے کہ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔

سب سے بڑی تلوار تو وہ شعور ہے جو خطرات و خدشات کا رخ بھانپ سکے، یہ قومی شعور جذبات کی نمی اور عقیدت کی گرمی سے نہیں پنپتا، یہ صرف حقیقت کو حقیقت کی روشنی میں دیکھتا ہے اور یہی ادراک ایک ایسی قیادت کو وجود بخشتا ہے جو اتحاد و وحدت کے اصل مفاہیم سے آشنا ہو، کیسی عجیب بات ہے کہ ہماری زبانیں اتحاد کے لفظ کا ورد اس وقت کرتی ہیں جب الکشن یا الکشن جیسے کسی تماشے کی نوبت آتی ہے، اس وقت اتحاد کی آوازیں اتنے گوشوں سے ابھرتی ہیں کہ دیکھنے اور سننے والے عالم حیرت میں اتحاد کے ہر حرف کو انتشار میں تبدیل ہوتے دیکھتے رہ جاتے ہیں، اردو اخباروں کے مصور اشتہاروں میں جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ فلاں کو ووٹ مت دو اور ساری توجہ فلاں کی شکست پر مرکوز کرو تو اس منفی طرز فکر پر تعجب ہوتا ہے اور ذہن کو یہ سوال کرنے کا یارا ہوتا ہے کہ اسی بات کو مثبت طریقہ سے بھی تو کہا جاسکتا تھا کہ بہتر سے بہتر کو نظر انتخاب میں لایا جائے، اپنے سے کہیں زیادہ افرادی قوت والے طبقہ کو اس منفی طریق سے دور کرنے میں کیا دانائی ہے؟ افسوس تو

یہ ہے کہ فراست کی نعمت سے بہرہ یاب قوم کا یہ انداز ایک روایت بن چکا ہے، کم از کم ہندوستان کی ایک صدی کی تاریخ تو یہی کہتی ہے کہ گردش لیل ونہار خواہ کتنے ہی تغیرات کا سبب بنے، ہم اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں آج بھی پس وپیش میں ہیں کہ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

علامہ شبلی نے سو سال پہلے کہا تھا کہ پالیٹکس دنیا کا سب سے بڑا جذبہ ہے...... اس سے تمام قوتیں مشتعل ہوتی ہیں وہ انسان میں ہر قسم کا ایثار پیدا کر دیتا ہے...... اگر ہماری پالیٹکس دراصل پالیٹکس ہوتی تو جدو جہد اور ایثار وخود فروشی کے جذبات خود بخود ساتھ پیدا ہوتے۔ ہماری تاریخ سو سال کے بعد ایک نہایت نازک مقام پر ہے، آسمان رنگ بدلتا رہتا ہے، اس کا اثر تو ہونا ہی ہے دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا۔

دارالمصنّفین اور معارف کی قدر افزائی میں ہمارے پڑوسی ملک پاکستان کے جذبات محبت، ایک شریف ہم سایہ کی بہترین تصویر ہیں، پاکستان کے مختلف علمی وتعلیمی ادارے، مشکلوں کے باوجود اپنے علمی تحائف سے دارالمصنّفین سے تجدید محبت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں سندھ یونیورسٹی جام شورو کے شعبہ اردو کی جانب سے وہاں کے بلند پایہ علمی وتحقیقی شش ماہی مجلّہ تحقیق کے دس شمارے موصول ہوئے، ان میں ہر شمارہ بہترین مقالات کا بیش بہا خزانہ ہے، خصوصاً مکتوبات نمبر تو نہایت وقیع ہے جس میں حسام الدین راشدی، بابائے اردو، مولانا احسن مارہروی، نثار احمد فاروقی، جگن ناتھ آزاد، گیان چند، رشید حسن خاں، مالک رام، حیرت شملوی، سید اختر امام، نواب مشتاق گرمانی، ابن فرید اور ابو محمد سحر کے خطوط شامل ہیں، معارف اس نوازش علمی کے لیے ڈاکٹر نذیر احمد مغل وائس چانسلر، ڈاکٹر نور افروز اور مجلّہ کے مدیر ڈاکٹر سید جاوید اقبال اور ادارہ تحقیق کا ممنون ہے۔ اسی طرح اسلام آباد کی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کا تحقیقی وتنقیدی مجلّہ ''معیار'' ڈاکٹر رشید امجد کی ادارت میں واقعی اسم بامسمی ہے، اسلام آباد ہی کی الخیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو کا مجلّہ ''تحقیقی زاویے'' کے نام سے ہے، ڈاکٹر انعام الحق جاوید اور رشید امجد کی ادارت میں یہ مجلّہ بھی مجسم خیر ہے۔ ہم ان رسالوں اور ان کے اداروں کے لیے دعا گو ہیں اور معارف نوازی کے لیے سراپا سپاس بھی ہیں۔

مقالات

مدارسِ نظامیہ کا علمی و فکری کردار

ڈاکٹر محمد سہیل شفیق

تعلیم کے میدان میں مدارسِ نظامیہ کا قیام نظام الملک طوسی کا بڑا کارنامہ تھا۔ ان درس گاہوں نے علمی کارناموں کی تاریخ پر اپنا دوام ثبت کردیا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ مدارس نظامیہ کی تعمیر خاص سیاسی و مذہبی عوامل کا نتیجہ تھا۔ ان مدارس نے پانچویں صدی کے نصف دوم میں اپنی کارکردگی کے آغاز سے تین صدیوں سے زیادہ عرصہ تک دنیائے اسلام یا کم ازکم عالم اسلام کے مشرقی حصے اور سلجوقی حکام اور عباسی خلفاء کی قلم رو میں سیاسی، علمی اور مذہبی میدانوں میں بے مثال تبدیلیاں پیدا کیں۔ مدارس نظامیہ نے علمی پہلوؤں سے قطع نظر اپنے دینی جلسوں، وعظ و مناظرہ کی پرجوش مجالس کے انعقاد اور مذہبی مجادلوں کے ذریعہ طلبہ و علماء بلکہ ارباب حکومت و سیاست اور عوام الناس کو بھی اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

مدارس نظامیہ کو بہت جلد ایسی عالم گیر شہرت ملی کہ یہ پورے عالمِ اسلام میں علماء، فقہاء اور واعظین کا مرکز بن گئے۔ نظام الملک طوسی نے ان مدارس کے اساتذہ کے لیے بیش بہا تنخواہیں اور طلبہ کے لیے وظائف مقرر کیے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہل علم کی سماجی خوشحالی کے مطلوب اثرات سامنے آئے۔ اس عمل نے بہت سے اکابر و اعیان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ خواجہ نظام الملک کی روش کی پیروی کرتے ہوئے رفاہ عامہ کے مراکز اور مدارس اور علمی مجامع (انجمنیں) قائم کریں اور ان امور کو سرانجام دینے کے لیے زیادہ سے زیادہ اموال اور اوقاف مختص کریں۔

علامہ شبلی نعمانی کے الفاظ میں:

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی، کراچی۔

"حقیقت یہ ہے کہ نظامیہ کی عزت کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ دنیا میں سب سے پہلا مدرسہ تھا، بلکہ اس لیے ہے کہ اس کی عالم گیر شہرت نے تمام پچھلی یادگاروں کو اس طرح دلوں سے بھلا دیا کہ گویا اس سے پہلے کوئی دارالعلم بنا ہی نہ تھا۔ خود بغداد میں بھی تو اس سے کچھ پہلے الپ ارسلان سلجوقی کا ایک مدرسہ موجود تھا، جو زرخطیر کے صرف سے تیار ہوا تھا، مگر آج کتنے آدمی ہیں جو اس کا نام بتا سکیں"۔(۱)

مدارس نظامیہ کے عہد کے مذہبی، سیاسی اور علمی اکابر ورجال کے حالات کے مطالعہ و تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مدارس نے دینی علوم کی اشاعت وترویج اور بے شمار علمی مراکز کے قیام سے کیسے مثبت ومفید اثرات پیدا کیے۔ جنہیں ہم یہاں مختصراً بیان کرتے ہیں:

۱۔ مذاہب اہل سنت کی تجدید حیات: تیسری صدی ہجری کے آغاز میں اسلامی فکری زندگی پر مذاہب اہل سنت کی وہ گرفت بتدریج ختم ہوچکی تھی، جو انہیں خلافت عباسیہ کے اوائل میں حاصل تھی اور جو ہارون الرشید (۱۷۰ھ/۷۸۶ء۔۱۹۳ھ/۸۰۹ء) کے زمانہ حکومت میں غلبہ و استحکام میں اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ تیسری صدی ہجری کے قریب آتے ہی فرقہ معتزلہ (۲) کی تحریک، مامون الرشید (۱۹۸ھ/۸۱۳ء۔۲۱۸ھ/۸۳۳ء) کی تائید وحمایت سے اور لوگوں کو اس مکتب فکر کے عقائد ونظریات قبول کرنے پر آمادہ کرنے سے اپنی عظمت کی بلندی پر پہنچ گئی۔ مامون کے بعد دو عباسی خلفاء یعنی معتصم باللہ (۲۱۸ھ/۸۳۳ء۔۲۲۷ھ/۸۴۲ء) اور واثق باللہ (۲۲۷ھ/۸۴۲ء۔۲۳۲ھ/۸۴۷ء) نے بھی اس سلسلہ میں اس کی پیروی کی۔ متوکل علی اللہ (۲۳۲ھ/۸۴۷ء۔۲۴۷ھ/۸۶۱ء) کے دورِ خلافت میں اسماعیلیوں کی دعوت کے آغاز اور پھیلاؤ سے معتزلہ کی تحریک سستی کا شکار ہوگئی۔ اسماعیلیوں کا خفیہ پروپیگنڈہ دوسری صدی ہجری کے آغاز سے ہوا۔ اس دور میں اسے مستحکم ہونے کا موقع ملا۔ یہاں تک کہ دنیائے اسلام کے مغرب میں فاطمی سلطنت (۳) قائم ہوگئی۔ نئی حکومت نے تھوڑی مدت میں مصر پر اپنا تسلط مستحکم کرلیا۔ دنیائے اسلام کے مغرب میں جس وقت یہ سیاسی اور مذہبی تبدیلیاں رونما ہورہی تھیں اس وقت عالم اسلام کے مشرقی علاقوں (جیسے فارس وعراق) پر آلِ بویہ نے غلبہ پاکر خلافت عباسی کو اپنا مطیع وفرمانبردار

بنالیا اور تشیع کی مکمل حمایت سے آزادانہ شیعی افکار و عقائد کو پھیلانا شروع کردیا۔(۴)

تھوڑا عرصہ گزرا تھا کہ شیعہ انقلاب کے قائد ارسلان بساسیری نے بغداد پر قبضہ کرلیا اور ۴۵۰ھ میں مصر کے فاطمی خلیفہ مستنصر باللہ (۶۵۹ھ/۱۲۶۲ء تا ۶۶۱ھ/۱۲۶۳ء) کا نام خطبہ میں داخل کردیا گیا۔(۵) اس کے ساتھ ہی شیعوں کا اقتدار بلندترین مقام پر پہنچ گیا۔ بغداد میں شیعوں کے ساتھ مخصوص عبادات وشعائر کے ساتھ اذان دینے کا مطلب درحقیقت عراق کے علاقے پر فاطمی خلفاء کی سیادت وغلبہ کا اعلان تھا۔

یہ دور مذاہب اہل سنت کے لیے پرآشوب اور پرازمصائب تھا۔ عین اس وقت جب صورت حال اس قدر خراب ہوچکی تھی کہ خلافت عباسی پر قبضہ کیا جاچکا تھا ایک بے مثال عظیم قوت نے اسلام کے سیاسی افق پر جلوہ نمائی کی۔ یہ قوت خلافت عباسی کی محافظ اور بغداد کے سنی العقیدہ خلفاء کی حامی تھی۔ اس نے اہل سنت کے عقائد کو نئی زندگی بخشی۔ سنی المذہب خلفاء کے احترام ووقار کو بحال کیا۔ خلافت عباسی کے زوال کو روک دیا۔ یہ تازہ دم اور بھرپور قوم سلجوقی ترکمانوں کی حکومت تھی جو مشرقی ایران میں قائم ہوئی اور بہت جلد دارالخلافہ بغداد پہنچی۔

سلجوقی، خلافت عباسی کے نگہبان اور اس کے حامی بن کر آئے۔ ۴۵۱ھ میں طغرل بیگ نے ارسلان بساسیری کو قتل کردیا۔ اور سلجوقی ترک بغداد میں آل بویہ کے جانشین بنے۔ طغرل بیگ اور اس کے بھتیجے الپ ارسلان نے خلافت عباسی کے اس حصہ کو جو فاطمیین مصر کے قبضہ میں چلا گیا تھا ان کے قبضہ سے نکالا۔(۶)

مذاہب اہل سنت اور شیعوں میں نہ صرف فقہی اور مسلکی اختلافات تھے، بلکہ دونوں فرقے سیاسی بالادستی کے لیے جدوجہد کررہے تھے۔ راسخ العقیدہ علماء اور تعلیمی اداروں دونوں کو فطری طور پر اسماعیلیوں کی قوت میں اضافے پر تشویش تھی، کیونکہ یہ اپنے اثر اور اقتدار کے باعث عوام میں سنی مسلک کی پیروی کو ختم کرسکتی تھی۔ اس سے اس بات کی بھی وضاحت ہوجاتی ہے کہ نظام الملک ملحدین کے خلاف جنگ کرنا کیوں اپنا فرض سمجھتا تھا، وجہ یہ تھی کہ اگر ان کو یوں ہی چھوڑ دیا جاتا تو وہ مذاہب اہل سنت کی بیخ کنی کرتے اور سیاسی اقتدار کو بھی ختم کردیتے۔(۷)

خلافت عباسی کو ختم کرنے کی کوشش کے نتیجے میں آل بویہ نے عراق اور خراسان میں جو

مضطرب سیاسی حالات چھوڑے تھے۔اس نے آلِ سلاجقہ اور متعدد علماء کواس بات پر آمادہ کیا کہ چاروں فقہی مذاہب سے ماخوذ قواعد اسلام کوراسخ و مستحکم کرنے کی خاطر وہ پہلے خراسان اور ماوراء النہر میں مدارس تعمیر کریں اور پھر عراق میں مدرسے قائم کریں اور یوں وہ اس علاقے میں پھیلنے والے باطنی اور اسماعیلی خطروں کا سد باب کریں۔(۸)

یہ بات یقینی ہے کہ تعلیمی طریقے اور تربیتی پروگرام ہی اتنے موثر ہتھیار ہیں کہ جن سے شیعی پروپیگنڈہ کا مقابلہ کیا جاسکتا تھا۔درحقیقت تعلیم سے استفادہ ضروری اور ناگزیر دکھائی دیتا تھا تاکہ دوصدیوں (تیسری اور چوتھی صدی) پر محیط دور میں جو شیعی اور معتزلی تحریکیں مذاہب اہل سنت کو کمزور کرنے کا سبب بنی تھیں ان کے اثرات کو محو کیا جاسکے۔(۹)

اگر چہ اس مدت کے دوران اشراف نے مذاہب اہل سنت کی پیروی اختیار کیے رکھی اور اپنے عقائد ونظریات پر کاربند رہے تاہم عامۃ الناس اور معاشرہ کے عام افراد باطنی (۱۰) شیعہ مبلغوں اوران کے تعلیمی طریقہ کار کے لیے خام مواد ثابت ہوئے۔باطنی مبلغ گوناگوں طریقوں سے تبلیغ کرتے۔عوام کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے جدید فنون اور باطنی شعبدہ بازیوں سے کام لیتے۔باطنیوں نے اپنے بنیادی اغراض و مقاصد کے لیے پروپیگنڈہ کے جملہ ذرائع اپنائے۔خفیہ اور اعلانیہ دعوت کا کام کیا۔باطنیوں نے خلافت عباسی کے کئی سرکردہ افراد اور سرکاری کارندوں کو اپنے ساتھ ملالیا۔ان باطنیوں نے یہاں تک طاقت حاصل کرلی کہ دو بڑے اور خطرناک انقلاب لانے میں کامیاب ہوگئے۔ایک جمہوری قرمطی بحرین (۱۱) اور دوسرا سلطنت فاطمیہ۔انہوں نے مغرب اور مصر میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ان کو یہ حیثیت حاصل ہوگئی کہ قریب تھا کہ وہ خلافت عباسی کو خود دارالخلافہ سے ختم کردیں۔(۱۲)

فاطمیوں کی اساسی تدابیر پر مبنی ہمہ جہت منصوبوں اور اسماعیلی شیعوں کے پروپیگنڈے (۱۳) سے پیدا ہونے والے نتائج کے بالکلیہ ازالہ کے لیے ضروری تھا کہ انہی کے مثل تعلیمی پروگرام بنائے جائیں اوران پر عمل درآمد کیا جائے اور اسلامی معاشرہ میں قابل لحاظ تعلیمی کارکردگی سے ان سیاسی اور مذہبی مظاہر کا مقابلہ کیا جائے۔نظام الملک طوسی ایک صاحب علم وزیر اور سیاست و مذہب کے تمام فنون اور حکمرانی کے جملہ رسوم ورموز سے آگاہ تھا۔وہ اس حقیقت کو سمجھتا

تھا کہ خصوصی مدارس کے قیام سے برپا کی جانے والی تحریک بذات خود ایک بہترین ہتھیار اور مذاہب اہل سنت کی تہذیب کے احیاء و اشاعت کے لیے ایک بہترین وسیلہ ہے اور اس سے ہی مخالفین کا مقابلہ بہتر طور پر کیا جا سکتا ہے۔(۱۴) مدارس نظامیہ کے قیام سے نظام الملک نے شافعی، اہل حدیث اور اشعری مذہب سے تعلق رکھنے والے پراگندہ اہل سنت کو یکجا کیا۔ مخالف مذاہب جیسے معتزلہ، شیعہ اور متعدد فرقوں اور ان کی خفیہ و ظاہری تنظیموں نے اہل سنت کو جس طرح نقصان پہنچایا تھا اور انھیں ختم کرنے کے درپے ہو گئے تھے، نظام الملک نے اس کے ازالہ کے لیے انہیں متحد و یکجاں کر کے مخالف مذاہب کے مقابلے کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا۔(۱۵)

مدرسین نظامیہ بغداد، نظام الملک کے نمائندہ بھی تھے۔ جو اپنے زمانے کے حالات و مسائل کا ادراک رکھتے تھے اور عالم اسلام کی علمی و عملی اور روحانی و فکری رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔(۱۶) یہی وجہ ہے کہ پانچویں صدی ہجری میں مذاہب اہل سنت کی تجدید حیات و کامیابی اور شیعی تحریکوں کی پے درپے سیاسی و فکری شکستوں میں مدارس نظامیہ نے انتہائی اہم کردار ادا کیا اور خلافت عباسیہ اور سلطنت سلاجقہ کو استحکام بخشا۔ انہی اداروں کے ذریعہ نظام الملک نے اپنے زیر انتظام عالم اسلام کی عملی زندگی کو نئی توانائی بخشی۔

۲۔ سرکاری اور قومی مدارس کے قیام کی تحریک: پانچویں صدی ہجری کا نصف دوم اسلامی مدارس کے قیام میں ایک عصر جدید کا آغاز ثابت ہوا۔ خواجہ نظام الملک نے اس کی ابتداء کی کہ سیاسی مفادات اور مملکت کے سرکاری فقہی مذہب کی تائید و اشاعت کی خاطر مدرسہ کے وجود سے استفادہ کیا جائے نیز مخالفین بالخصوص شیعوں اور اسماعیلی فرقہ کے عقائد و آراء کو باطل ثابت کرنے اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے مدرسہ سے خوب استفادہ کیا جائے۔ خواجہ کے اس اقدام سے سرکاری مدارس کے قیام کی راہ ہموار ہوئی۔(۱۷)

رفتہ رفتہ تمام ممالک محروسہ میں نظامیہ کی طرز پر مدرسے قائم ہوتے چلے گئے۔ ان میں تیس مدرسے بغداد میں تھے، بیس دمشق میں، تیس اسکندریہ میں اور چھ موصل میں۔ قاہرہ، نیشاپور، سمرقند، اصفہان، مرو، بلخ، حلب، غزنی اور لاہور جیسے اہم شہروں میں کم از کم ایک ایک مدرسہ موجود تھا۔ جہاں تک ہسپانیہ کا تعلق ہے، اس کے صرف ایک شہر قرطبہ ہی میں کئی سو مدرسے

تھے اوران کے منجملہ کم ازکم چھ مدرسے تو ایسے تھے جن میں دینیات کے ساتھ ساتھ فلسفہ، ادب، تاریخ اور سائنس (ایک درجن شعبے) کی تعلیم دی جاتی تھی۔ (۱۸) چنانچہ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں اسلامی ممالک میں بہت کم ایسے مقامات تھے جو دینی مدارس اور علمی مراکز سے خالی ہوں۔ یہ دور مدارس کی کثرت کے لحاظ سے اسلامی تہذیب وتمدن کی تاریخ میں اہم ترین ادوار میں شمار ہوتا ہے۔ الفرڈ گیام کے الفاظ میں:

"It would be a positive injustice to belittle the zeal and enthusiasm for learning for the sake of learning which animated large numbers of men throughout the vast Muhammadan empire.(۱۹)

''یہ ماننا پڑے گا کہ یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے اپنی وسیع قلمرو کے اندر بے شمار لوگوں میں ''حصول علم بغرض علم'' کے لیے بےنظیر شوق پیدا کردیا''۔

خواجہ نظام الملک کے قائم کردہ مدارس نے علمی مراکز اور مدارس کے روز افزوں قیام کے میدان میں بہت بڑی تبدیلی پیدا کردی تھی۔ بعض مدارس نے مذہبی مسائل پر بحث وتحقیق کے دائرہ سے باہر قدم رکھا اور کم وبیش تمام علوم وفنون میں کارکردگیوں کا آغاز کردیا۔ (۲۰) اس لیے یہ امر قابل توجہ ہے کہ جن حضرات نے نظام الملک کو اسلامی مدارس کا سب سے پہلا بانی قرار دیا ہے۔ غالباً انھوں نے کوئی غلط بات نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ مدارس نظامیہ جس طرح کے منظّم پروگرام اور وسیع انتظامات رکھتے تھے، ان سے پہلے کے اسلامی ادوار میں قائم کردہ سرکاری اور نجی علمی مراکز جیسے بغداد میں مامون کا بیت الحکمت، قاہرہ میں جامع الازہر اور سلطان محمود غزنوی، عضدالدولہ دیلمی اور فاطمی خلیفہ الحاکم کے قائم کردہ مدارس اتنے وسیع ومنظّم نہ تھے۔ پھر مدارس نظامیہ نے علمی مراکز کے پھیلاؤ اور قیام میں جو تبدیلیاں پیدا کیں وہ ان سے پہلے کے علمی مراکز میں واقع نہ ہوسکی تھیں۔

مدارس نظامیہ کے قیام سے پہلے معمول یہ تھا کہ کچھ دیندار لوگ حصول ثواب اور اخروی نجات کی خاطر اور دینی علوم کے پھیلاؤ کے لیے مقامی طور پر مدرسے قائم کرلیا کرتے تھے۔ مگر

مدارس نظامیہ کے قیام نے اور دنیائے اسلام میں ان مراکز کی بڑھتی ہوئی قدر و منزلت نے مدارس کے قیام کے میدان میں ایک زبردست تحریک پیدا کردی اور بہت سے بادشاہوں، خلفاء اور اکابر مملکت کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ نظام الملک کی روش کی پیروی کرتے ہوئے اپنے اپنے نام سے مدرسے قائم کریں۔ چنانچہ ان میں سے بعض حضرات نے تو محض اخروی ثواب کی خاطر اور خدمت دین کے جذبے کے تحت اور بعض نے اپنے سیاسی اقتدار کو مضبوط کرنے کی خاطر اور کچھ لوگوں نے خواجہ نظام الملک کا مقابلہ کرنے کے لیے اس طریقہ کی پیروی کی۔

جلد ہی بغداد بڑے بڑے مدارس کا مرکز بن گیا جو نظامیہ کے قیام کے بعد یہاں اسی طرز پر بنائے گئے۔ ابن جبیر اندلسی جس نے چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں بغداد دیکھا تھا اس شہر کے مدارس کی تعداد تیس بتاتا ہے۔ (۲۱) اس کے بعد بھی بغداد میں دوسرے اہم مدارس قائم کیے گئے ان میں سب سے اہم اور انتہائی باشکوہ مدرسۂ مستنصریہ تھا۔

خاندانِ نوریہ اور صلاحیہ نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد شام و مصر کے ممالک میں سرکاری مدارس قائم کرکے تمام ممالک سے زیادہ بہتر اور بہت جلد پیش رفت مدارس کے قیام کے سلسلے میں کی۔ مصر و شام کے فرماں روا نور الدین محمود زنگی (م ۵۶۹ھ) جس نے صلیبیوں کے غاصبانہ قبضہ سے تقریباً پچاس قلعوں اور شہروں کو آزاد کرایا تھا۔ ان ممالک کے شہروں میں بڑے بڑے مدارس قائم کیے۔ بالخصوص دمشق میں جو اس کا پایہ تخت تھا ایک بہت بڑا مدرسہ بنوایا۔ ابن جبیر کی تحریر کی رو سے وہ دنیا کے بہترین مدارس میں سے ایک تھا اور اسی کے بقول دمشق میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جو شخص بھی مدرسہ بنوائے گا اس کا خرچ جتنا بھی ہوگا وہ شاہی خزانہ سے ادا کیا جائے گا اور خود نور الدین نے اپنی ذاتی ملکیت کے دیہات کو مدارس کے قیام اور تمام علمی مراکز کی تعمیر کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ (۲۲)

نور الدین کے دربار کے تربیت یافتہ صلاح الدین ایوبی (م ۵۸۹ھ) نے بھی مصر پر قبضہ کرنے کے بعد اسماعیلیوں کی کاروائیوں اور ان کے تبلیغی مراکز کو ختم کرنے کے بعد اس علاقے میں شافعی، حنفی اور مالکی مدارس کے قیام میں اولیت حاصل کی۔ (۲۳) ۵۷۲ھ میں صلاح الدین ایوبی نے ''مدرسہ صلاحیہ'' جسے جلال الدین سیوطی نے دنیا کے بہت بڑے مدارس

میں سے ایک قرار دیا ہے، امام شافعی کے مزار کے پاس تعمیر کروایا اور اس مدرسہ کے فقہاء و مدرسین کے لیے روزانہ کا راشن اور ماہانہ تنخواہیں متعین ومقرر کردیں۔(۲۴)

اس دور میں مدارس کی بہتات کا ایک اور مؤثر سبب مدارس نظامیہ کے فارغ التحصیل علماء تھے کہ یا تو یہ خود یا پھر ان کے حامی امراء وحکام مذہب شافعی کی ترویج کے لیے مدارس قائم کرتے تھے۔اپنے زمانہ کے مشہور فاضل اور نظامیہ بغداد کے تعلیم یافتہ قاضی ابوالمحاسن بہاء الدین شافعی (م۶۳۲ھ) نے کئی مدرسے حلب میں قائم کیے۔(۲۵)

امیر منصور شرفتکین نائب حکومت اربل نے ۵۳۳ھ میں ایک مدرسہ ابوالعباس خضر بن نصر اربلی شافعی (م ۵۶۹ھ) کی خاطر بنوایا جو نظامیہ بغداد کے شاگردوں میں سے تھے۔ وہ اربل میں پڑھانے والے پہلے شخص ہیں۔(۲۶) اسی طرح اپنے زمانہ کے نابغہ روزگار اور نظامیہ بغداد کے فارغ التحصیل ابوالقاسم محمود بن مبارک واسطی (م۵۹۲ھ/۶۱۸ھ) کے لیے مدرسہ جاروجیہ دمشق میں بنوایا گیا۔(۲۷) نظامیہ بغداد کے ایک اور فارغ التحصیل علامہ نجم الدین ابو محمد بادرائی (م۶۵۵ھ) نے دمشق میں اپنے نام سے ایک مدرسہ بادرائیہ تعمیر کروایا اور اس کے قواعد وضوابط میں نظامیہ کی تقلید کی۔(۲۸)

چھٹی صدی ہجری کے مورخ وادیب عماد کاتب اصفہانی جو ابتدا میں نظامیہ بغداد کے طالب علم رہے تھے، ۵۶۲ھ میں دمشق تشریف لے گئے تو نورالدین زنگی نے ان کا زبردست اکرام واستقبال کیا۔ دربار میں اعلیٰ مراتب سے نوازا اور ان کی درخواست پر نوریہ کے عظیم مدرسہ میں تدریس پر مامور کیا۔(۲۹)

چھٹی صدی کے نصف دوم میں ان علاقوں کی سیاحت کرنے والے ابن جبیر اندلسی نیز محمد نعیمی دمشقی نے جنہوں نے شروع سے لے کر دسویں صدی کے نصف اول (۹۲۷ھ) تک مدارس دمشق کو اپنی گراں قدر کتاب ''الدارس فی تاریخ المدارس'' میں شمار کیا ہے۔اس سے ہمیں اس علاقے میں مدارس کی کثرت وعظمت بالخصوص مدارس شافعیہ جو پانچویں صدی ہجری کے بعد قائم ہوئے، ان سے واقفیت ہوتی ہے۔(۳۰)

مدارس نظامیہ کے قیام کے بعد عالم اسلام کے مشرقی علاقوں اور بلاد ایران میں بھی

اسلامی مدارس کے قیام نے وسعت پائی۔ جس وقت خواجہ نظام الملک اصفہان میں نظامیہ کی تعمیر میں مصروف تھا، ملک شاہ سلجوقی نے اپنے مشہور وزیر کی تقلید میں اس شہر کے محلّہ کراں میں ایک مدرسہ تعمیر کروایا اور باوجودیکہ وہ حنفی المذہب تھا اس نے نظام الملک کے برعکس اپنے مدرسہ کو شافعی اور حنفی دونوں کے لیے وقف کردیا۔

آذربائیجان کے شہروں میں چھٹی صدی کا آغاز مدارس اور علمی مراکز کے قیام کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ بڑے علماء کی موجودگی اور مذہبی مجادلوں کے پھیلاؤ کے سبب خراسان کے شہروں میں بھی تعمیر مدارس کا سلسلہ تیزی سے پھیلنے لگا۔ اگر اندرونی شورشیں اور ترکان غز کے پے در پے حملے اور پھر تاتاریوں کے بے رحمانہ کشت وخون نے کچھ وقت دیا ہوتا تو عین ممکن تھا کہ وہ کاروان علوم و معارف جنھوں نے اس علاقے سے اپنے ترقی و تکمیل کے سفر کا آغاز کیا تھا منزل مقصود پر پہنچ جاتے اور ایسے ایسے نابغہ روزگار علماء ظاہر ہوتے جو اپنے سے پہلے کے علماء ابن سینا، بیرونی، خیام وغیرہم کے تحقیقی کاموں اور کارکردگیوں کو آگے بڑھاتے۔ مگر افسوس کہ پے در پے جنگوں اور خوں ریزیوں نے اس ترقی کا موقع نہ دیا۔

مغلوں کے حملوں سے بچ جانے والے ادبی آثار اور تذکروں اور تاریخی کتب کے مطالعہ و تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ماوراء النہر کے تمام ممالک، خراسان، طبرستان، آذربائیجان، جبال، خوزستان، فارس، کرمان، اصفہان اور سیستان میں پانچویں صدی کے اواخر سے لے کر مغلوں کے حملوں تک بے شمار مدارس اور علمی مراکز قائم کیے گئے اور ان کے قیام کا موثر سبب یا تو دینی اور سیاسی اکابر کی نظام الملک کی روش کی تقلید و پیروی کرنا تھا یا پھر ان مراکز کے بانی غالباً خود مدارس نظامیہ کے پرورش یافتہ تھے۔

مختصر یہ کہ مدارس نظامیہ نے اپنے اثر سے ایک عجیب گرمجوشی تمام ممالک اسلامیہ میں پیدا کردی تھی، چھٹی صدی ہجری تک اسلامی دنیا کا کوئی گوشہ (بجز اسپین) علمی عمارتوں سے خالی نہ رہا، خراسان کے بڑے بڑے صوبے مثلاً نیشاپور، ہرات، بلخ اور ایران کے علاقے گو پہلے سے علم و فضل کے مرکز تھے، مگر نظامیہ کے اثر نے اور بھی مالا مال کردیا۔ (۳۱)

۳۔ علوم دینیہ خصوصاً فقہ شافعی کی ترویج و اشاعت: بانی مدارس نظامیہ نظام الملک طوسی

چونکہ مذہب شافعی کا پیرو کار تھا۔جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ اس کا خیال تھا کہ وہ ان مراکز کے قیام سے مذہب شافعی کو عام کرکے اور اس کی تعلیم کا بندوبست کر کے اثناء عشری شیعوں اور اسماعیلیوں کے فتنہ کا سد باب اوران کی ترویج کا راستہ روک سکتا ہے۔چنانچہ اس نے ان مدارس کے قیام کا تہیہ کرلیا اوران مدارس میں تعلیم وتعلم کوشافعی مذہب کے پیروکاروں کے لیے مختص کردیا۔ وہ اپنے سیاسی اقتدار اور تمام مادی امکانات کو اس مقصد کے حصول کے لیے بروئے کار لایا۔ ایک طرف اس بااختیار وزیر کی شافعی مذہب کے ساتھ شدید جانبداری اور دوسری طرف سلجوقی سلاطین اور خلفاء بغداد کی حمایت وتائید جو سب سنی تھے، نے مذہبی علوم ومعارف کی توسیع وترقی کے لیے اس طرح راہ ہموار کی کہ اسلامی عہد کے کسی دور میں کم ہی اس کی مثال ملتی ہے۔

نظام الملک وہ پہلا شخص تھا جس نے شافعی مذہب کو بطور ایک سرکاری مذہب اور خلافت عباسیہ کے کے لیے قابل قبول مذہب قرار دے کر اسے عراق اور عالم اسلام کے مشرقی علاقوں میں رائج کیا۔فقہ شافعی کے بہت سے طلبہ آگے چل کر بہت سے اسلامی شہروں اور ملکوں میں علمی، سیاسی اور مذہبی اعلیٰ مناصب پر فائز ہوئے۔ بلاشبہ شافعی مذہب کے فروغ اور استحکام میں مدارس نظامیہ نے بنیادی کردار ادا کیا۔(۳۲)

مدرسہ نظامیہ کے درسی مواد میں سے ایک اہم مضمون علم خلاف تھا۔اس مضمون کے مطالعہ نے ان مدارس کے مدرسین وفقہاء کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ تمام اسلامی مذاہب پر بھی غور وفکر اور تحقیق کریں۔ان عوامل واسباب کے نتیجے میں فن خطابت، جدل، اصول اور کلام کے مضامین کو بھی بڑی ترقی ملی۔اس دور کے علماء نے ان موضوعات پر کثرت سے کتابیں اور رسالے قلم بند کیے۔(۳۳) شافعی مذہب میں بالخصوص مذکورہ مضامین میں کتابیں تالیف ہوئیں۔ کیوں کہ مدارس نظامیہ عموماً اور نظامیہ بغداد خصوصاً اپنے وسیع امکانات کے ساتھ شافعی مذہب کی اشاعت و ترقی کا مناسب مرکز بن چکے تھے،طالبان دین نے وظائف اور تنخواہوں سے استفادہ کرتے ہوئے اس مذہب میں تحقیق وتفحص سے کام لیا اور متعدد کتابیں شافعی مذہب سے متعلق تالیف کیں۔

ابن خلدون نے متکلمین کی اہم کتاب اصول فقہ میں امام الحرمین کی 'البرھان' اور غزالی کی 'المستصفیٰ' بتائی ہے۔(۳۴)اسی طرح امام الحرمین نے مذہب حنفی پر مذہب

شافعی کی ترجیح کے موضوع پر ایک کتاب 'مغیث الخلق فی اختیار الحق' لکھی۔(۳۵) نظامیہ بغداد کے استاد ابواسحاق فن مناظرہ وخلاف میں خود ایک آیت عظیم تھے اور کہا جاتا ہے کہ انہیں مسائل خلاف یوں یاد تھے جیسے مسلمانوں کو سورہ فاتحہ یاد ہوتی ہے۔(۳۶) ابوالمحاسن الرویانی اپنے زمانے میں، مذہب، اصول اور خلاف کے رؤوس الافاضل میں سے تھے (۳۷) مدرس نظامیہ بغداد، یوسف بن ایوب اصول فقہ، مذہب اور خلاف میں یکتا تھے۔(۳۸)

امام غزالی پانچویں صدی ہجری کے عظیم مصنف وفقیہ تھے۔ان کے وجود سے مدارس نظامیہ اور نیشاپور نے شہرت جاوید پائی۔امام غزالی نے شافعی مذہب اور اشعری طریقہ کو مکمل و آخری شکل دی۔انہوں نے جوانی میں ایک کتاب 'المنتحل فی فن الجدل' لکھی۔ان کی کتابیں "الوسیط"، "البسیط"، "الوجیز"، "الخلاصة" اپنے زمانہ تالیف سے ہی فقہ شافعی کی اہم کتابیں بن گئیں۔ان کتابوں نے باقی فقہی مولفات کی چمک دمک ماند کردی اور اس وقت سے لے کر آج تک غزالی کی کتابیں ہی شافعی طلبہ وفقہاء کے لیے رائج ومقبول کتب درس رہی ہیں۔(۳۹) ابواسحاق شیرازی، امام الحرمین جوینی اور امام محمد غزالی جیسے اساتذہ سے استفادہ نے فقہ شافعی کے دامن کو خوب پھیلا دیا اور ان اساتذہ کے حلقہ درس میں شرکت کے لیے طلبہ کے روزافزوں اشتیاق نے دیگر فقہی مذاہب کے پیروکاروں کو بھی اس مذہب کی طرف کھینچا۔ابن کثیر کی تحریر کے مطابق ''حنبلیوں کے دوسرکردہ اشخاص ابوالخطاب اور ابن عقیل غزالی کے حلقہ درس میں حاضر ہوتے تھے۔(۴۰)

امام غزالی نے دینی علوم اور شافعی مذہب کے بارے میں جو مفید اور سودمند کتابیں لکھیں انہوں نے اسلامی سرحدوں سے باہر نکل کر قرون وسطیٰ کے یورپ کے دینی لٹریچر کو بھی متاثر کیا۔ چنانچہ بعض مؤرخین کے خیال کے مطابق غزالی کی وہ کتابیں جو ۵۴۵ھ (بہ مطابق ۱۱۵۰ء) سے پہلے لاطینی میں ترجمہ ہوئیں، انہوں نے قرون وسطیٰ کے یہودی اور مسیحی دینی لٹریچر پر نمایاں اثرات مرتب کیے۔تو ماس اکویناس۔ مسیحی مذہب کے بڑے مذہبی پیشواؤں میں سے ایک ہے اس نے اور پاسکال نے غزالی کے افکار سے بالواسطہ اثر قبول کیا۔ یہ قابل ذکر ہے کہ افکار غزالی تمام اسلامی مفکرین کے افکار سے بڑھ کر مسیحی افکار پر اثر انداز ہوئے۔(۴۱)

یہاں اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ اگر چہ مدارس نظامیہ بنیادی طور پر دینی مدرسے تھے۔لیکن ان مدارس نے علوم انسانی کے ساتھ بھی انصاف روا رکھا۔یہ مدارس عوامی پیشوں کے لیے تیاری سے بھی وابستہ تھے۔(۴۲) مدارس نظامیہ بغداد ان لوگوں کی تعلیم کے لیے بھی تھا جو نظم عامہ (Public administration) میں عہدوں کے امیدوار ہوتے تھے۔(۴۳)

۴۔عربی زبان وادب کا فروغ: مدارس نظامیہ بغداد میں تدریس کی زبان عربی تھی۔عوام کے لیے وعظ وتذکیر کا عمل بھی عربی زبان میں تھا۔کیونکہ عربی زبان خراسان اور ماوراءالنہر کے علاقوں میں پھیل چکی تھی۔اسلامی فتوحات کے آغاز سے ہی ان علاقوں میں عرب آباد ہوگئے تھے۔حتیٰ کہ عباسی خلافت کے زوال کے بعد بھی عرب ان علاقوں میں آباد ہوتے رہے اور ان کو اپنا وطن بنالیا۔مدرسوں اور مسجدوں کی وہ مجالس جن میں اساتذہ املاء کراتے تھے وہ بھی عربی زبان میں ہی ہوتیں۔مختلف موضوعات پر لکھی جانے والی کتب کی زبان بھی عربی تھی۔معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان کے سوا کسی اور زبان کا تصنیف وتالیف میں استعمال علماء کے نزدیک غیر معیاری تھا۔چنانچہ عبدالغافر الفارسی نے بیان کیا ہے کہ نظامیہ بغداد اور نظامیہ نیشاپور کے مدرس امام غزالی کی علماء نے اس وجہ سے مخالفت کی کہ عربی زبان میں اپنے فصیح اسلوب کے باوجود انھوں نے کئی غیر عربی الفاظ استعمال کیے تھے۔(۴۴) لیکن واقعہ یہ ہے کہ انشاء،خطبات اور تحریر میں ان کا پایہ اتنا بلند تھا کہ وقت کے ارباب فصاحت وبلاغت ان کی مثال پیش کرنے سے عاجز اور درماندہ تھے۔وہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں پوری فصاحت وبلاغت کے ساتھ نظم ونثر لکھنے پر قادر تھے۔(۴۵)

مدرس نظامیہ بغداد ابن الدھان نحوی کو عربی،ترکی،عجمی،رومی،حبشی اور زنگی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔جب ان کی مجلس درس کا کوئی غیر عرب طالب علم،ان کے درس کے مطالب نہ سمجھ سکتا تو وہ طالب علم کی مادری زبان میں تشریح وتوضیح کر دیتے تھے۔(۴۶)

یہی وجہ کہ مدارس نظامیہ کے اثر سے عربوں کے علوم وفنون کی طلب اتنی زیادہ بڑھ گئی تھی کہ یورپ کی جانب سے قائم کردہ تعلیمی کونسل نے ۱۳۱۲ء میں عربی زبان کی تعلیم کو ویانا پیرس، بولون،آکسفورڈ اور سلمانکا کی جامعات میں لازمی قرار دے دیا تھا۔(۴۷)

۵۔علماء ومدرسین کا احترام: اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلندی مراتب اور رفع درجات کا ذریعہ

ایمان اور علم ہے۔ارشادِ ربانی ہے:

یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ (سورۃ المجادلۃ:۱۱)	اللہ تعالیٰ ان کے جو تم میں سے ایمان لائے اور جن کو علم دیا گیا درجات بلند فرمادے گا۔اور اللہ کو تمہارے سب کاموں کی پوری خبر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام کے نزدیک جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر نہیں ہیں۔اسلام کے ترقی یافتہ دستور میں ہر مسلمان کا یہ انسانی فریضہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ عالم کے مرتبہ کو بڑا سمجھے اور استاد کا احترام کرے۔جو حضرات اس مقدس فریضہ کو انجام دیتے ہیں وہ اسلام کے سماجی نظام میں گہرے احترام کے مستحق ہوتے ہیں۔آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

فضل ھذا العالم الذی یصلی المکتوبۃ ثم یجلس فیعلم الناس الخیر علی العابد الذی یصوم النھار و یقوم اللیل کفضلی علی ادناکم ۔(۴۸)	اس عالم کی فضیلت جو فرائض ادا کرنے کے بعد لوگوں کو خیر کی تعلیم دے،اس عابد پر جو دن کو روزہ رکھے اور رات عبادت میں گزارے ایسی ہے جیسا کہ میری فضیلت تم میں سے ادنی پر۔

مدارس نظامیہ کے قیام نے مدرسین کو اعلیٰ سماجی قدر و منزلت سے نوازا۔علماء وفقہاء لوگوں کے مختلف طبقوں نیز خلفاء اور بادشاہوں کے یہاں ایسے اثر و رسوخ کے مالک بنے کہ معاملات و امور کے بست و کشاد میں ان کی نظر صائب،وقیع اور لائق اطاعت ٹھہری۔اساتذہ اور معلمین ہمیشہ آزاد رہے اور آزادی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔یہی وجہ ہے کہ لوگوں میں ادب، لحاظ،احترام اور حفظ مراتب کا خیال تھا،امیر و غریب یکساں طور پر اہل علم کی عزت کرتے تھے۔

نظامیہ بغداد کی عمر میں بھی خدا نے بڑی برکت دی،اور جب تک بغداد کی حکومت قائم رہی،اس کی فیاضیاں بھی دور دراز ملکوں تک اپنا اثر پہنچاتی رہیں۔ہر زمانہ میں علماء کے لیے نظامیہ کی مدرسی سے بڑھ کر کوئی بات اعزاز کی نہیں ہوسکتی تھی۔دو سو برس کی مدت میں کوئی ایسا شخص اس منصب پر مقرر نہیں ہوا،جو اپنے زمانے میں یکتائے فن و یگانہ دہر نہ سمجھا جاتا ہو۔(۴۹)

جب عباسی خلیفہ قائم بامر اللہ (۴۲۲ھ/۱۰۳۱ء۔۴۶۷ھ/۱۰۷۴ء) فوت ہوا تو نئے

خلیفہ کے انتخاب کے لیے لوگوں نے نظامیہ بغداد کے عالی مرتبہ مدرس ابواسحاق کی رائے کو قبول کیا۔انہوں نے مقتدی بامراللہ (۴۶۷ھ/۱۰۷۴ء۔۴۸۷ھ/۱۰۹۴ء) کو خلیفہ قرار دیا۔(۵۰) یہی خلیفہ جب حنابلہ اور شافعیہ کے مابین تصادم اور ملک شاہ کے نمائندوں ابوالفتح بن ابی اللیث کی امورِ خلافت میں مداخلت کی وجہ سے بے بس ہو گیا تو اس نے ابواسحاق کو ملک شاہ اور خواجہ نظام الملک کے پاس اپنا سفیر بنا کر خراسان بھیجا۔ابواسحاق کا اس سفر کے دوران راستے میں آنے والے شہروں میں بے مثال اور پرشکوہ استقبال ہوا۔ملک شاہ سلجوقی اور نظام الملک نے بھی نہ صرف قرار واقعی ان کی تکریم کی بلکہ خلیفہ کی طرف سے انہوں نے جو شکایات پیش کیں،انہیں دور کیا۔(۵۱) ابواسحاق شیرازی،نظام الملک کے ہاں اتنے زیادہ قابل احترام تھے کہ جب ابواسحاق کا انتقال ہوا تو نظام الملک نے اپنے بیٹے موید الملک کو جو شکوہ آمیز خط لکھا اس میں کہا: ضروری تھا کہ ابواسحاق کے مرتبہ کے احترام میں نظامیہ بغداد ایک سال تک بند رہے۔(۵۲)

جب نظامیہ نیشاپور کے مشہور مدرس امام الحرمین ابوالمعالی الجوینی کا انتقال ہوا تو ان کی وفات کے بعد ایک عجیب ماتم برپا ہوا۔لوگوں نے بازار بند کر دیئے اور تقریباً ایک ماہ تک کسی شخص نے سر پر پگڑی نہیں باندھی۔ان کے تقریباً چار سو شاگرد جو سب کے سب علماء اور نزدیک اور دور کے شہروں اور علاقوں کے رئیس تھے ان کی تعزیت کے لیے بیٹھے۔(۵۳)

ان تمام شہروں اور مراکز میں جہاں مدارس نظامیہ قائم تھے دینی علوم کے علماء کے احترام کا یہی حال تھا۔نیشاپور میں امام الحرمین،اصفہان میں خاندان خجندی،مرو میں آل سمعان اور آمل میں ابوالمحاسن رویانی کو وہی مقام و مرتبہ حاصل تھا جو بغداد میں ابواسحاق رکھتے تھے۔

مدرسین نظامیہ جو اپنے زمانے کے ممتاز ترین علماء تھے،دوسری علمی و سیاسی بڑی شخصیتوں سے پہلے خلیفہ کی بیعت کی تقریبات میں حاضر ہوتے تھے۔حتیٰ کہ تاریخی واقعات کے ضمن میں ان کے تمام کارنامے درج کیے گئے ہیں۔ابن اثیر نے ۴۷۹ھ کے واقعات میں لکھا ہے:

> ”اس سال ابوالقاسم دبوسی (م ۴۸۲ھ) نظام الملک کی طرف سے فرمان تدریس پا کر اس شان و شوکت کے ساتھ بغداد میں وارد ہوئے کہ اس کی مثال کسی نے بھی کسی فقیہ کے بارے میں نہ دیکھی ہوگی“۔(۵۴)

امام غزالی جب نظامیہ بغداد کے منصب تدریس پر فائز تھے تو وہ علمی اعتبار اور دنیاوی مقام و مرتبہ اور عالمگیر شہرت کے لحاظ سے مرتبہ بلند پر پہنچے۔ اور اس سے پہلے کہ وہ دنیوی عہدوں کو ٹھکرا کر آزاد منشوں کے حلقہ میں آئے۔ وہ ملک شاہ کی بیوی ترکان خاتون اور خلیفہ مقتدی کے مابین اختلاف ختم کرنے میں واسطہ بنے اور یہ کام کامیابی سے پورا کیا۔ وہ ان اکابر میں شامل تھے جنھوں نے ۴۷۸ھ میں مقتدی کی وفات کے بعد مستظہر کی خلافت کی تقریبات میں شرکت کی۔(۵۵) نظامیہ میں تدریس کے دوران غزالی کی شہرت اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ دیار مغرب میں جب یوسف بن تاشفین (۵۶) نے اپنے مخالفین کو ہٹانے اور نالائق حکمرانوں کو معزول کرنے کی کوشش کی اور اس نے اپنے وقت کے نامور فقہاء سے فتویٰ لینا چاہا تو اندلس کے معروف قاضیوں کے فتویٰ کے ساتھ ساتھ اس نے ضروری سمجھا کہ وہ مشرق کے اس مشہور فقیہ اور مدرس نظامیہ بغداد سے فتویٰ لے۔(۵۷)

علماء وفقہاء، مدارس نظامیہ میں تحصیل و تدریس کے نتیجے میں علمی وسماجی درجات کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچے۔ اس طرح نظام الملک نے نہ صرف سلطنت کے عوام کی ذہنی ترقی کو یقینی بنادیا، بلکہ سلطنت کو روشن دماغ اور لائق سرکاری عمال اور قضاۃ بھی مسلسل ملنے لگے۔(۵۸)

۶۔ **یورپ کی قدیم یونیورسٹیوں پر اثرات:** مشرق و مغرب کے تمام مؤرخین اور محققین کے خیال کے مطابق مدارس نظامیہ عموماً اور نظامیہ بغداد خصوصاً اعلیٰ اسلامی مدارس اور یونیورسٹیوں کے حکم میں سمجھے جاتے ہیں۔ ان مدارس نے دنیائے اسلام میں علمی مراکز کے قیام اور ان کی کارکردگی کے فروغ کے میدان میں عظیم تبدیلی لانے کے علاوہ انتظامی اور تعلیمی لحاظ سے بھی اور بعض علمی مضامین میں اثر انداز ہونے کی جہت سے بھی ایک عظیم نمونہ بنے اور ان کے اصول و ضوابط اور طریقہ ہائے کار کو یورپی یونیورسٹیوں میں اپنایا گیا۔(۵۹)

یورپ کی اخلاقی و ذہنی ویرانی و خراب حالی کی طویل صدیوں میں اسلام ترقی کا ہراول تھا۔ عیسائیت نے اپنے آپ کو قیصروں کے تخت پر تو متمکن کرلیا تھا، لیکن وہ اقوام عالم کو نئی زندگی نہ بخش سکی تھی۔ چوتھی صدی عیسوی سے لے کر بارہویں صدی عیسوی تک یورپ کی تاریکی بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔ شدید تعصب کے اس دور میں کلیسائیت نے تمام وہ روزن بند کر رکھے تھے جن

سے علم، انسانیت یا تہذیب کی روشنی داخل ہوسکتی تھی۔ چنانچہ جہالت کے اس حصار میں اسلام کی باریابی کے تمام راستے مسدود تھے۔ اس کے باوجود اسلامی تمدن کے فیض رساں اثرات عیسوی دنیا کے ہر گوشے میں سرایت کر گئے۔ بغداد، دمشق، قرطبہ، غرناطہ، اور مالقہ کی درس گاہوں سے فلسفے کی مشفقانہ تعلیمات اور سائنس کی مقابلۃً سخت عملی ہدایات دنیا کو تہذیب کے سبق دیتی رہیں۔ (۶۰)

یورپ کی قدیم یونیورسٹی سالہ نو اتیالیا بھی اسلامی مدارس کے اثرات سے خالی نہ تھی۔ دوسرے بڑے بڑے مراکز جیسے پیرس میں بولونیا یونیورسٹی نیز مونپلیہ اور آکسفورڈ یونیورسٹیاں یہ سب بارہویں صدی عیسوی کے بعد قائم ہوئیں یعنی ان کا قیام اسلامی یونیورسٹیوں کے قیام کے ایک مدت بعد عمل میں آیا۔ حتیٰ کہ یورپی یونیورسٹیوں میں رائج بعض الفاظ و رسوم جیسے قرأت (Reading) سماع (Hearing)، سبق الروایۃ (Baccaloreus) اور اجازہ (Licence) جیسے اجنبی الفاظ بعض محققین کے نزدیک اسلامی مدارس میں مروج رسوم والفاظ کے مشابہ ہیں۔ (۶۱)

جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا کہ عربوں کے علوم وفنون کی طلب اتنی زیادہ بڑھ گئی تھی کہ یورپ کی جانب سے قائم کردہ تعلیمی کونسل نے ۱۳۱۲ء میں عربی زبان کی تعلیم کو یورپی جامعات میں لازمی قرار دے دیا تھا۔

مشہور مستشرق الفرڈ گیام اپنے ایک مقالے بعنوان ''فلسفہ وعلم الٰہی'' میں لکھتا ہے:

> ''اگر عرب بھی مغلوں کی طرح وحشی و بربری ہوتے (جنھوں نے مشرق میں علم کے شعلے کو ایسا بجھایا کہ وہ دوبارہ روشن نہ ہوسکا۔ اور شاید آیندہ بھی کبھی روشن نہ ہوسکے۔ اس کے کتب خانے جلادیے اور اس کی ادبی روایات کو تباہ کردیا) تو یورپ کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک میں کم ازکم سوسال کی تاخیر ہوگئی ہوتی۔ فن طباعت کی ایجاد سے پیشتر اہل علم کی زندگی بے حد دشواریوں اور مایوسیوں سے لبریز تھی۔ مشرق اور مغرب میں مسلمانوں کی یونیورسٹیوں کے قیام سے پہلے طالب علم کو کسی معلم کی تلاش میں ایک ہزار میل یا اس سے زیادہ کا سفر لازماً اختیار کرنا پڑتا تھا۔ نوجوان طالب علم ہسپانیہ سے مکہ تک یا مراکش سے بغداد تک طویل سفر افلاس کی حالت میں طے کرتے تھے۔ تاکہ کسی مشہور عالم ومعلم کے قدموں میں حصول علم کے لیے بیٹھ سکیں''۔ (۶۲)

آگے لکھتا ہے:

''یہاں پر چند جملے اسلامی یونیورسٹیوں کے متعلق لکھنا مناسب ہوگا۔ پہلی مشہور یونیورسٹی بغداد کی ''نظامیہ'' تھی۔ جس کو ۴۵۷ھ میں (یعنی انگلستان میں نارمنوں کی فتح سے ایک سال پیشتر) عمر خیام کے دوست اور الپ ارسلان کے ترک وزیر نظام الملک نے قائم کیا تھا۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد نیشا پور، دمشق، بیت المقدس، قاہرہ، اسکندریہ اور دیگر شہروں میں بھی بڑے بڑے دارالعلوم قائم ہوگئے۔ (۶۳) قدیم ترین مسیحی یونیورسٹیاں بولونا، پیرس، مونٹ پلیر اور آکسفورڈ بارہویں صدی عیسویں میں قائم ہوئیں۔ یورپ کی پہلی ''عربی یونیورسٹی'' مسلمانوں نے قائم نہیں کی بلکہ مسلمان علوم کی تدریس کے لیے قائم ہوئی اور یہ خاصی مدت کے بعد وجود میں آئی۔ الفانسو دانش مند (۸۱۔۱۲۵۲ء) نے اس زمانے کے ایک نہایت عالم فاضل شخص ابوبکر الرقوطی کی خدمات حاصل کیں۔ اور اس کے لیے ایک مدرسہ قائم کر دیا۔ جس میں فاضل مذکور (ابوبکر رقوطی) مسیحیوں، یہودیوں اور مسلمانوں کو تمام علوم کی تعلیم دیتا تھا''۔ (۶۴)

اس کے بعد الفرڈ گیوم مدرسہ مستنصریہ بغداد کی تعلیم و تدریس، نظم و نسق اور اوصاف و خصوصیات کے بارے میں تفصیل سے لکھتا ہے اور مستنصریہ بغداد کو تیرہویں صدی عیسوی کے اوائل کی قابل فخر جامعہ قرار دیتے ہوئے کہتا ہے:

''یورپ کی یونیورسٹیاں بلاشبہ مشرقی یونیورسٹیوں کے بعد وجود میں آئی ہیں اور ازمنہ وسطیٰ کے اہل علم کی شہادت سے یہ حقیقت بالکل روشن ہو جاتی ہے کہ ان کو علم و تحقیق کا زیادہ تر مواد اسلامی علوم ہی سے حاصل ہوا ہے''۔ (۶۵)

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے:

''اگر ہم دسویں اور گیارہویں صدی میں مسلمانوں کے پڑھے جانے والے مضامین کا موازنہ گیارہویں اور بارہویں صدی میں مسیحی طلبہ کے زیر مطالعہ و تعلیم مضامین سے کریں تو ہم دیکھیں گے کہ مشرق و مغرب کی یونیورسٹیوں کا باہمی ربط و تعلق اس سے کہیں زیادہ تھا جواب تک فرض کیا جاتا رہا ہے۔ وہی مرتب و منظم تحصیل علم و مطالعہ کتب، استاد اور شاگرد کا باہمی تعلق، یومیہ

خوراک اور اوقاف کے حقوق کا مسئلہ، انتظام اور ڈسپلن، تعلیم و تربیت کے درجات اور سرٹیفکیٹس اور حصول علم و دانش کی کارکردگیاں اور سرگرمیاں یقیناً مشرق و مغرب کے تحصیل علم کے مراکز جیسے بغداد اور آکسفورڈ میں کم و بیش یکساں تھیں۔تاہم بطور یقین یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مسیحی یونیورسٹیوں کے تمام ہی اصول و ضوابط مکمل طور پر اسلامی یونیورسٹیوں جیسے تھے۔یہ تو ظاہر ہے کہ بعض حصوں میں کافی مشابہت پائی جاتی ہے جیسے وہ اجازت نامہ یا سند (سرٹیفیکیٹ) جو مسلمان استاد ایک طالب علم کو انفرادی طور پر دیتا تھا تاکہ وہ خاص کتاب کی تدریس کر سکے۔ظاہر ہے کہ یہ رسم ازمنہ وسطیٰ کے ''لائیسنس'' سے ملتی جلتی ہے۔جو ڈگری کی بالکل ابتدائی شکل تھی''۔(۶۶)

اسلامی اور مسیحی یورپی مدارس کے انتظامی اور تدریسی نظام میں یہ وجوہ مشابہت الفرڈ گیام کی نظر میں گیارہویں اور بارہویں عیسوی صدیوں سے پہلے کے باہمی ربط و تعلق کے نتیجے میں تھے۔یعنی اس سے ایک صدی پہلے جب دسویں صدی عیسویں میں نظامیہ بغداد قائم ہوا۔

اسی طرح سے نظامیہ بغداد میں دینیاتی تعلیم کا مقام وہی تھا جو آگے چل کر یورپی جامعات میں ادبیات عالیہ کی تعلیم کو حاصل ہو گیا تھا۔روبن لیوی (بغداد کرانیکل، مطبوعہ کیمبرج، ۱۹۲۹ء) کا خیال ہے کہ اس مدرسے کی تنظیم کی بعض تفصیلات کی یورپ کی قدیم جامعات نے نقالی کی تھی۔(۶۷)

مشہور مستشرق ڈبلیو منٹگمری واٹ اپنی کتاب "The Influence of Islam on Medieval Europe" میں اس بات کا بھرپور اعتراف کرتا ہے کہ اسلام کے اثرات یورپ پر اس سے کہیں زیادہ ہیں جو ہم سمجھتے آرہے ہیں۔اس کے الفاظ قابل توجہ ہیں:

"When one keeps hold of all the facets of the medieval confrontation of Christianity and Islam, it is clear that the influence of Islam on Western Christendom is greater than is usually realized. Not only did Islam share with the Western Europe many material products and technological discoveries; not only did it stimulate

Europe intellectually in the fields of science and philosophy; but it provoked Europe into forming a new image of itself. Because Europe was reacting against Islam, it belittled the influence of the Saracens and exaggerated its dependence on its Greek and Roman heritage. So today, an important task for our Western Europeans, as we move into the era of the one world, is to correct this false emphasis and to acknowlege fully our debt to the Arab and Islamic world." (۶۸)

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ مصر و شام کا علاقہ دو ادب پرور خاندانوں، خاندان نوریہ اور صلاحیہ کی وجہ سے اسلامی علوم کی موزوں پناہ گاہ بنا۔ ان افراد یا نظامیہ کے فارغ التحصیل حضرات جو غالباً ان کے حمایت یافتہ تھے، کے ہاتھوں اس علاقے کے شہروں میں جو مدارس قائم ہوئے وہ اپنے داخلی نظام اور تدریسی پروگراموں میں بالکل نظامیہ بغداد کی پیروی کر رہے تھے۔ پھر صلیبی جنگوں میں مسلمانوں اور عیسائیوں کا باہمی رابطہ بھی انہی علاقوں میں شروع ہوا۔ ان دو قوموں کے باہمی ملنے جلنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیوں نے مسلمانوں سے بہت سے علوم وفنون سیکھے۔ اس بات کو یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا ایک مؤثر سبب قرار دیا جا سکتا ہے۔ (۶۹)

اور یہ بات اب بالکل واضح ہے کہ ان اسباب میں سے ایک اسلامی مدارس بالخصوص نظامیہ بغداد کا اثر تھا جو اپنے زمانے کا سب سے بڑا دارالعلم تھا۔ اسلامی مدارس کے انتظامی اور تدریسی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اس کے علمی وفکری پہلوؤں نے بھی یورپ پر اثر ڈالا۔ نظامیہ نیشاپور اور نظامیہ بغداد کے ایک مدرس امام محمد غزالی کے فکری اثرات کے بارے میں الفرڈ گیام اپنے سابق الذکر مقالہ میں ایک دوسرے مقام پر لکھتا ہے:

''جب غزالی کے عقائد وافکار پر مشتمل لٹریچر اہل مغرب کے ہاتھ لگا تو اس نے مسیحی مفکرین کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کیا اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ان کتابوں کا پوری

باریک بینی سے مطالعہ کریں۔ بارہویں صدی عیسویں میں طلیطلہ کے مترجمین کی محنت سے غزالی کی وہ تصانیف منظر عام پر آئیں جو منطق، طبیعیات اور مابعد الطبیعیات کے متعلق تھیں۔(۷۰) ریمنڈ مارٹن (۷۱) وہ پہلا شخص تھا جس نے "تہافۃ الفلاسفہ" کی اہمیت کو سمجھا اور اس کے بڑے حصے کو اپنی کتاب Pugio Fidei میں شامل کیا' اور اس کتاب کے پہلوؤں پر بحث کی۔(۷۲)

تعلیم کے لیے رفاہی اداروں کا قیام اور اوقاف کا نظام بھی یورپ نے علاوہ دیگر چیزوں کے ان مدارس اسلامیہ سے مستعار لیا۔ اس سے پہلے یورپ میں اس کا کوئی تصور نہ تھا۔(۷۳)

آخر میں اس نکتے کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ ہم نے گذشتہ صدی کے نصف آخر میں جدید یونیورسٹیوں کے قیام کے بعد مغرب کی یونیورسٹیوں کی جو مستعمل اصطلاحات جیسے پروفیسر، اسٹنٹ پروفیسر، اور لیکچرر کے مرادف مستعار لی ہیں اور جن اصطلاحات سے ہم استفادہ کر رہے ہیں۔ درحقیقت یہ وہی اصول وضوابط ہیں جو یورپی یونیورسٹیوں نے مدارس نظامیہ و مستنصریہ میں رائج نظام سے مستعار لیے تھے۔ جیسے یورپی یونیورسٹیوں نے معید، نائب مدرس اور مدرس کے القاب، حتیٰ کہ سیاہ لباس (جبہ یا گاؤن) پہننا اور پڑھاتے وقت کرسی پر بیٹھنا یہ سب کچھ مدارس نظامیہ میں مروج طریقہ سے اخذ کیا ہے۔

۷۔ تدریس کے بارے میں خاص ضوابط اور مدرسین وطلبہ کی خوشحالی پر توجہ: مدارس نظامیہ کی تاسیس سے پہلے چند مستثنیٰ حالات کے ماسوا مدرسین اور طلبہ کی زندگی زیادہ تر مساجد و مدارس تک محدود تھی اور وہ عموماً مشقتوں اور بے سروسامانی سے عبارت تھی۔ مدارس نظامیہ کے قیام کے ساتھ ان طبقوں کی زندگی میں ایک ہمہ گیر تبدیلی رونما ہوئی اور انہیں زندگی کی سختیوں سے نجات ملی۔ اوقاف اور متعین تنخواہوں کی بدولت ان کی زندگی کامل اطمینان واستحکام سے بہرہ ور ہوئی۔ اساتذہ اور طلبہ کو ایک بے مثال سماجی حیات ملی اور اس طبقہ کی مادی زندگی میں نئے دور کا آغاز ہوا۔

دین مبین میں علم کی شان اور علماء کے مقام ومرتبہ کے پیش نظر وسیع دنیائے اسلام میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جو علم کے طالبوں اور اہل خیر سے خالی ہو۔ اس بات کا انکار نہ کرنا چاہیے کہ جب تک مدارس نظامیہ قائم نہ ہوئے اور ان کے جدید نوعیت کے پروگرام سامنے نہ آئے تھے تو اس وقت تک عوام کے مختلف طبقات اور ذمہ دار افراد نے بھی علم وتعلیم اور علماء و مدرسین سے

متعلق مسائل پر کما حقہ توجہ نہ کی تھی۔ مدارس خصوصاً نظامیہ کے قیام کے بعد تو یہ حال ہوا کہ سب اصحاب خیر نے ان کی روش کی تقلید کی حتیٰ کہ عباسی خلیفہ مستنصر باللہ (۶۲۳ھ/۱۲۲۶-۶۴۰ھ/۱۲۴۳ء) نے نظامیہ کی تقلید میں مدرسہ مستنصریہ کی بنیاد رکھی جہاں طلبہ مفت تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اساتذہ کے لیے ماہانہ وظائف مقرر تھے۔ مدرسہ کا باورچی خانہ تمام اساتذہ اور شاگردوں کو گرم غذا، نان اور گوشت مہیا کرتا تھا۔ طلبہ کو کتاب، قلم اور کاغذ مفت دیئے جاتے تھے۔ اہل مدرسہ کی خوشحالی کی خاطر حمام اور ہسپتال موجود تھے۔ (۷۴)

نظام الملک کے طریقہ کار کی پیروی کرتے ہوئے نورالدین زنگی نے مغربی طلبہ کے استفادہ کے لیے سات باغات اور اراضی مختص کر رکھی تھی جن کی سالانہ آمدنی پانچ سو دینار تک پہنچ جاتی تھی۔ اس کے شاہی خزانہ سے پانچ سو طلبہ وظائف پاتے تھے۔ اس کے جانشین صلاح الدین ایوبی کے زمانہ میں اہل علم کے لیے مختص وظائف اور تنخواہوں کا خرچ سالانہ تین لاکھ دینار سے زیادہ ہوتا تھا۔ (۷۵)

مدارس نظامیہ نے عمل تدریس کے لیے بھی خصوصی قواعد وضوابط وضع کیے کہ اس سے پہلے ان کی مثال نہ تھی۔ مدارس میں شب وروز کے تعلیمی طریق کار کو منظّم کیا گیا۔ اساتذہ اور طلبہ کو ہر طرح کی سہولتیں دی گئیں۔ انہیں رہائش، خوراک اور معاشی کفالت مہیا کی گئی۔ ان کے حقوق ادا کیے گئے۔ مراعات سے نوازا گیا، تعلیمی وظائف دیے گئے۔ ان سب اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ علم، علماء اور علمی امور سے متعلق افراد کو تقویت ملی۔ وہ رہائش اور خوراک کے معاملہ میں آسودہ خاطر ہو گئے۔ اب ان کو بہترین موقع ملا کہ وہ فارغ البال اور آسودہ حال ہوں اور پوری یکسوئی سے ہمہ تن تدریس وتحقیق میں مصروف رہیں۔ (۷۶)

نوجوانان ملک، ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہیں مدارس نظامیہ کا رخ کیا کرتے تھے، وہیں رہتے بھی تھے، عوائد واوقاف سے ان کی ضروریات بآسانی پوری ہو جاتی تھیں اور نہایت اطمینان وآسائش کے ساتھ ممتاز اساتذہ کے حلقہ درس سے مستفید ہو کر اعلیٰ ترین درجات علوم وفنون طے کرتے تھے۔ (۷۷)

البتہ مدارس نظامیہ کے قیام کے بعد سے منصب تدریس ہر شخص کے بس میں نہ رہا۔ مدرس کا

انتخاب بادشاہ، یا خلیفہ یا مدرسہ کے وقف کنندہ کی طرف سے ایک فرمان کی صورت میں کیا جاتا تھا۔ استاد تدریس کے دوران ایک مخصوص لباس پہنتا تھا، کرسی تدریس پر جلوہ افروز ہوتا تھا۔ لہٰذا ہر مدرس اپنے طور پر بلند عہدہ نہیں پا سکتا تھا۔ جب تک کہ اس میں علمی حیثیت، شہرت اور سماجی مقبولیت کی صفات نہ پائی جائیں۔ اثبات کی صورت میں وہ اس اہم امر کی سرانجام دہی کی اہلیت و موزونیت رکھتا تھا۔ ان مدارس کا قیام ذہین و فطین طلبہ کے لیے ایک مناسب موقع تھا کہ وہ طالب علمی کا دور گزارنے کے بعد، ان مدارس میں اپنی علمی زندگی بہ صورت استاد یا بطور معید شروع کریں۔ اس بات کا بھی امکان ہوتا تھا کہ طالب علم استاد کی وفات کے بعد یا کسی بھی وجہ سے جب استاد تدریس سے کنارہ کشی اختیار کر لے اس منصب میں استاد کا جانشین ہوتا تھا اور اپنے استاد کی جگہ لینے کے لیے اس کی صلاحیت و استعداد مناسب ہوتی تھی۔(۷۸) مدرسین نظامیہ بغداد، امام غزالی، ابوبکر الشاشی، محمود بن مبارک واسطی، مجدالدین یحییٰ بن ربیع، ابوالحسن فارقی و دیگر مشاہیر نے اپنی علمی زندگی کا آغاز بطور معید ہی کیا تھا۔

مدارس نظامیہ کے لائحہ عمل اور طریق کار، حصول تعلیم کے مختلف پہلوؤں نیز وظائف اور تنخواہوں کے تقرر و تعین اور اس نوع کے مسائل پر توجہ دینے کے لیے مدارس نظامیہ نے جو نظام اور ضوابط بنائے وہ ان تمام مدارس کے لیے نمونہ اور بنیاد بنے جو پانچویں صدی ہجری کے بعد معرض وجود میں آئے۔ طلبہ اور اساتذہ کی زندگی آرام و آسودگی کے مرحلے میں داخل ہوگئی اور ان کے لیے متعین حقوق و مراعات مقرر ہو گئے۔

۸۔ حصول علم کے مساوی مواقع: مدارس نظامیہ کے دروازے، شائقین علم کے لیے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ طالب علم کو اس کے پسندیدہ مضمون میں حصول علم کے لیے بھرپور تعاون ملتا تھا۔ طالب علم کو جس استاد کے علم پر اعتماد ہوتا تھا اور جسے وہ چاہتا تھا، منتخب کر لیتا تھا۔ اس کے لیے ہر طرح سے حصول علم کی آزادی فراہم کی جاتی تھی۔ اسے علم حاصل کرنے کی مناسب فرصت ملتی تھی۔ تحصیل دانش اسے کبھی بھی نہ تو روزی کمانے سے روکتی تھی اور نہ ہی اس کے راستہ میں مدرسہ سے باہر نکل کر اخراجات زندگی پورا کرنے کے لیے کوئی رکاوٹ تھی۔ اسے بھرپور مالی امداد دینے میں بھی بخل سے کام نہیں لیا جاتا تھا تاکہ وہ پورے اطمینان اور دلجمعی سے مطالعہ اور تعلیم میں مصروف رہے۔ جس میں حصول علم کی خواہش اور صلاحیت ہوتی تھی، وہ اپنا مقصد حاصل کر سکتا تھا کیونکہ تعلیم مفت اور اعلیٰ ترین

معیار کی ہوتی تھی اور طالب علم کو یونیورسٹی کی طرف سے رہائش اور خوراک مفت ملتی تھی۔ (۷۹)

اس لحاظ سے آج ہمیں ایک ایسے سنہرے دور کا انتظار ہے جس میں سب کو یکساں تعلیمی استفادے کے مواقع ملیں۔ سماجی واجتماعی ضمانت ملے اور سچی و حقیقی جمہوریت وجود میں آئے۔ یہ سب سہولتیں اسلام کے درخشندہ دور کے نظام تعلیم میں موجود تھیں اور طلبہ ان سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ چونکہ یہ تعلیمی لائحہ عمل محدود و تنگ نظر اغراض و مقاصد کے لیے مرتب نہیں کیے گئے تھے بلکہ یہ عملی زندگی کے متن سے اخذ کردہ حقائق اور ثمرہ حیات تھے۔ لہٰذا یہ زندہ اور جاندار لائحہ ہائے عمل تھے جو اپنی قوت و مدد خود زندگی سے حاصل کرتے تھے اور انہی خصوصیات کی حامل ہونے کی وجہ سے اسلامی تعلیمی مراکز اور یونیورسٹیاں آج کی بہت سی جدید یونیورسٹیوں سے ممتاز تھیں۔ (۸۰)

آج کا انسانی معاشرہ جن جمہوری آراء و مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں ہے ان میں سے بہت سے آراء و اہداف کو سب سے پہلے پیش کرنے کا شرف اسلامی یونیورسٹیوں کو حاصل ہے۔ (۸۱) آج آزادی فکر، مفت تعلیم، سماجی تحفظ اور شہر علم و دانش آباد کرنے کی آرزوئیں کی جاتی ہیں۔ اس بات کا مطالبہ کیا جاتا ہے کہ معاشرہ کے تمام طبقات کو علوم و فنون کے سرچشموں سے سیراب ہونے کا موقع ملنا چاہیے۔ دنیا کے تمام انسانوں میں بلا لحاظ ملک و ملت، دوستی، بھائی چارے اور خیر سگالی کا جذبہ عام ہونا چاہیے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سب باتیں اسلام کی اعلیٰ تعلیمات کا پرتو ہیں اور ان پر دنیائے اسلام میں بہت پہلے عمل کیا جا چکا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

(۱) شبلی نعمانی، مقالات شبلی، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۵۵ء، ج ۳، ص ۳۹۔ (۲) مکاتب فکر و کلام میں معتزلہ سب سے بڑا مکتب فکر ہے۔ اس مکتب فکر کا ظہور دوسری صدی ہجری کے آغاز میں بصرہ میں ہوا۔ یہ لوگ حضرت حسن بصری کے حلقے میں نشست رکھتے تھے بعد میں ان سے جدا ہو گئے۔ معتزلی مکتب فکر کے بانی اور موسس واصل بن عطا اور عمرو بن عبید تھے۔ ان کا عقیدہ مرتکب گناہ کبیرہ کے بارے میں یہ تھا کہ نہ وہ کافر ہے نہ مومن، بلکہ کفر اور ایمان کے بین بین ہے۔ معتزلہ کا یہ عقیدہ تھا کہ حق ان کے ساتھ ہے اور باطل دوسروں کے ساتھ۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: زہدی حسن جاراللہ، "تاریخ معتزلہ"، اردو ترجمہ: رئیس احمد جعفری، سعید ایچ ایم کمپنی کراچی، جنوری ۱۹۶۹ء، ص ۳۱ تا ۵۸)۔ (۳) شمالی افریقہ کا ایک سب سے بڑا حکومتی سلسلہ۔ ان لوگوں نے خلافت بغداد کے متوازی دارالخلافہ بنایا۔ اس سلسلہ کا بانی عبیداللہ المہدی تھا۔ فاطمیوں نے ۲۹۷ھ سے

۵۶۷ھ تک یعنی تقریباً تین صدیوں تک حکومت کی۔ یہ حکومت سلطنت ایوبیہ کے بانی سلطان صلاح الدین کے ہاتھوں ختم ہوئی۔(۴) گولڈزیہر، **العقیدہ والشریعہ**، ص۲۰۳۔(۵) P.K. Hitti, History of the Arabs, New York, 1958, p.474-475۔(۶) Carl Brockelamann, History of the Islamic People, Munshiram Manoharlal Publishers, New Delhi, 1995, p.162۔

(۷) رضوان علی رضوی، نظام الملک طوسی، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی، ۱۹۹۵ء، ص۸۲۔(۸) ناجی معروف، **علماء النظامیات و مدارس المشرق الاسلامی**، مطبعۃ الارشاد، بغداد، ۱۳۹۳/ ۱۹۷۳ء، ص۱۴۔(۹) عبدالرحیم غنیمہ، **تاریخ الجامعات الاسلامیہ الکبری**، اردو ترجمہ: محمد ظہیر الدین بھٹی، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، طبع اول، ۱۹۹۹ء، ص۱۵۲۔(۱۰) باطنیہ یا اسماعیلیہ فرقہ، شیعوں سے نکلا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ حضرت امام جعفر صادقؒ کے بعد ان کے بڑے بیٹے اسماعیل کو امامت پہنچی اور انہی پر ختم ہوگئی۔ یہ فرقہ مختلف ناموں فاطمیہ، علویہ، باطنیہ، اسماعیلیہ، شیعہ، سبعیہ اور ملاحدہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور ہر نام ایک مخصوص جہت کا آئینہ دار ہے۔(تفصیلات کے لیے دیکھیے: جلال ہمائی، غزالی نامہ، اردو ترجمہ: رئیس احمد جعفری، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، طبع اول، ت ن، ص۴۴ تا ۴۸)۔(۱۱) قرامطہ، قرمطی کی جمع ہے یہ عربوں اور ''نبطیوں'' کی ان باغی جماعتوں کا نام تھا، جو ۲۶۴ھ/۸۷۷ء سے عراق زیریں میں زنج کی جنگ غلامی کے بعد منظّم ہوئیں اور جن کی بنیاد ایک ایسے اشتراکی نظام پر رکھی گئی جس میں شمولیت کے لیے بعض رسوم کا بجالانا ضروری تھا۔ پرجوش تبلیغ کے باعث اس خفیہ جماعت کا دائرہ عوام، کسانوں اور اہل حرفہ تک وسیع ہوگیا۔ الاحساء میں انھوں نے خلیفہ بغداد سے آزاد ہوکر ایک ریاست کی بنیاد رکھ لی۔ اور خراسان، شام اور یمن میں ان کے ایسے اڈے قائم ہوگئے جہاں سے ہمیشہ شورشیں ہوتی رہتی تھیں۔ بحرین کے قرامطہ کا بانی ابوسعید جنابی تھا۔ اس نے خلیج فارس کے مغربی ساحل کے مشہورترین شہر 'ہجر' جو بحرین کا پایہ تخت تھا اس پر قبضہ کرلیا۔ ابوسعید کے بعد اس کا بیٹا ابوطاہر سلیمان اس کا جانشین بنا۔ ابوطاہر نے ۳۱۷ھ میں مکہ مکرمہ پر حملہ کیا، حاجیوں کا قتل عام کیا۔ وہ بہت سے مال واسباب، اور قیدیوں سمیت حجر اسود کو بھی اکھاڑ کر بحرین لے گیا تاکہ اسے الاحساء میں نصب کرسکے۔ حجر اسود بائیس سال تک قرامطیوں کے قبضہ میں رہا۔ ۳۴۰ھ میں فاطمی خلیفہ المنصور کے حکم سے حجر اسود اہل مکہ کو واپس کردیا گیا۔(اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج۱۶/۲، ص۲۱ تا ۲۵)۔(۱۲) **تاریخ الجامعات الاسلامیہ الکبری**، ص۱۵۳۔(۱۳) اسماعیلیوں کی تبلیغی کاوش، نفسیاتی طریقوں اور رائج الوقت تشددانہ خفیہ قتل کا امتزاج تھی۔ ان کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ ظاہری تابعداری کے ذریعہ بااختیار لوگوں کا اعتماد حاصل کرلیتے تھے تاکہ حکومت میں کلیدی عہدوں پر فائز ہوجائیں اور اس طرح اپنا اثر ورسوخ بھی بڑھائیں اور شرانگیزی کرسکیں۔

(۱۴) **تاریخ الجامعات الاسلامیہ الکبری**، ص۱۵۳۔(۱۵) ایضاً، ص۱۵۶۔(۱۶) دیکھیے: George Makdisi, The Rise of Colleges, Edinburgh University Press, 1981, p.298۔

(۱۷) ایضاً، ص ۲۹۹۔۳۰۰۔ (۱۸) پروفیسر میاں محمد شریف، مسلمانوں کے افکار، ان کی ابتدا اور حاصلات، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۳۴۔ (۱۹) Alfred Guillaume, The Legacy of Islam, Oxford University Press, London, First Edition 1931, p.420۔ (۲۰) دیکھیے: Philip K. Hitti, "The Near East in History" (A 5000 Year History), D. Van Nostrand & Company, New York, 1960, p.270۔ ۲۱۔ ابن جبیر، رحلة ابن جبیر، اردو ترجمہ: رئیس احمد جعفری، نفیس اکیڈمی، کراچی، طبع اول، ۱۹۶۱ء، ص ۲۱۵۔۲۱۶۔ (۲۲) ایضاً، ص ۲۷۲۔ (۲۳) تفصیلات کے لیے دیکھیے: ابی العباس شمس الدین احمد بن محمد بن ابی بکر بن خلکان، ''وفیات الاعیان و انباء ابناء الزمان''، تحقیق: ڈاکٹر احسان عباس، منشورات الرضی قم، ۱۳۶۴ء، ج ۷، ص ۲۰۶۔۲۰۷۔ (۲۴) سیوطی، جلال الدین عبدالرحمٰن، حسن المحاضرة فی اخبار المصر و القاهره، مطبعۃ السعادۃ، مصر، ت ن، ج ۲، ص ۱۸۶۔ (۲۵) ابن خلکان، ج ۷، ص ۸۹۔ (۲۶) ایضاً، ج ۲، ص ۲۳۷۔ (۲۷) ابو محمد عبداللہ بن اسعد بن علی بن سلیمان الیافعی، ''مرآة الجنان و عبرة الیقظان''، الطبعۃ الاولیٰ، دائرۃ المعارف النظامیہ اللکائنۃ، حیدرآباد دکن، ۱۳۳۸ھ، ج ۳، ص ۳۷۳۔۳۷۴۔ (۲۸) جمال الدین عبدالرحیم الاسنوی، ''طبقات الشافعية''، دارالکتب العلمیہ، بیروت، طبع اول، ۱۹۸۶ء، ج ۱، ص ۲۷۷۔ (۲۹) ابن خلکان، ج ۵، ص ۱۴۹۔ (۳۰) رحلہ ابن جبیر ۲۲۲۔۲۷۲، الدارس ۱: ۶۲۲۔ (۳۱) شبلی نعمانی، مقالات شبلی، ص ۴۳۔ (۳۲) تاریخ الجامعات الاسلامیه الکبری، ص ۱۵۶۔ (۳۳) جلال ہمائی، غزالی نامہ، مترجمہ: رئیس احمد جعفری، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، طبع اول، ت ن، ص ۳۴۔ (۳۴) عبدالرحمٰن بن خلدون، مقدمہ ابن خلدون (حصہ دوم)، مترجمہ: مولانا راغب رحمانی، نفیس اکیڈمی کراچی، طبع دہم، ستمبر ۱۹۸۶ء، ص ۳۵۲۔ (۳۵) ابن خلکان، ج ۳، ص ۱۲۹۔ (۳۶) غزالی نامہ، ص ۳۴۔ (۳۷) ابن خلکان، ج ۳، ص ۱۹۸۔ (۳۸) ایضاً، ج ۷، ص ۷۸۔ (۳۹) غزالی نامہ، ص ۲۴۱۔ (۴۰) عماد الدین ابی الفدا اسماعیل ابن عمر بن کثیر، ''البداية و النهاية فی التاريخ''، مطبعۃ السعادۃ مصر، ت ن، ج، ص ۱۷۳۔ (۴۱) P.K. Hitti, History of the Arabs, p.432۔ (۴۲) دیکھیے: Philip K. Hitti, "The Near East in History", p.258۔ (۴۳) Arnold J. Toynbee, "A study of Histroy", Vol. IV, Oxford University Press, London, 1952, p.362۔ (۴۴) علماء النظاميات و مدارس المشرق الاسلامی، ص ۱۳۔ (۴۵) غزالی نامہ، ص ۲۲۹۔ (۴۶) ابن کثیر، ج ۱۳، ص ۷۰۔ (۴۷) الدکتور محمد البهی، الفكر الاسلامی الحديث و صلة بالاستعمار الغربی، دارالفکر بیروت، ۱۹۵۷ء، ص ۵۸۲۔ (۴۸) دارمی، ج ۱، ص ۱۱۰۔ (۴۹) شبلی نعمانی، مقالات شبلی، ص ۴۱۔ (۵۰) مراۃ الجنان ج ۳، ص ۱۱۰۔ (۵۱) دیکھیے: ابی الحسن علی بن ابی الکرم الشیبانی المعروف بابن اثیر، ''الكامل فی التاريخ''، دارالاحیاء التراث العربی، بیروت، ۱۹۹۶ء، ج ۶، ص ۲۸۵۔۲۸۶۔ (۵۲) ابن خلکان، ج ۱، ص ۳۱۔

(۵۳) ایضاً، ج ۳، ص ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ (۵۴) ابن اثیر، ج ۸، ص ۱۴۴۔ ۱۵۲۔ (۵۵) غزالی نامہ، ص ۱۲۹۔ (۵۶) یوسف بن تاشفین دلیر، بہادر اور عادل بادشاہ تھا۔ اس نے مغرب میں مراکش شہر کی حد بندی کی۔ اندلس کے باشندے یوسف بن تاشفین کی پناہ لیا کرتے تھے۔ (ابن خلکان، ج ۷، ص ۱۱۲)۔ (۵۷) عبدالحسین زرین کوب، فراراز مدرسہ "دربارہ زندگی و آثار ابوحامد غزالی"، انجمن آثار ملی، تہران، ۱۳۵۳، ص ۸۸۔ (۵۸) رضوان علی رضوی، نظام الملک طوسی، ص ۶۴، بحوالہ: بارنٹ ملر، دی پیلس اسکول آف محمد دی کونکرر، کیمبرج، ہارورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۴۱ء، ص ۱۲۔ (۵۹) P.K. Hitti, History of the Arabs, p.425 ۔ (۶۰) S. Ameer Ali, Spirit of Islam, Christophers London, Oct. 1953, p. 396-397 ۔ (۶۱) دیکھیے: George Makdisi, The Rise of Colleges, p.276 ۔ (۶۲) Alfred Guillaume, The Legacy of Islam, p. 241 ۔ (۶۳) ایضاً۔ (۶۴) ایضاً، ص ۲۴۲۔ (۶۵) ایضاً، ص ۲۴۳۔ (۶۶) ایضاً، ۲۴۴۔ (۶۷) مسلمانوں کے افکار، ان کی ابتدا اور حاصلات، ص ۳۲۔ ۳۳۔ (۶۸) W.M. Watt, The influence of Islam on Medieval Europe, Edinburgh University Press, 1972, p.84 ۔ (۶۹) تفصیلات کے لیے دیکھیے: ارنسٹ بارکر کا مقالہ "The Crusades" (The Legacy of Islam), p. 40-77 ۔ (۷۰) ایضاً، ص ۲۷۰۔ (۷۱) یورپ میں علوم مشرق کا پہلا مکتب (۱۲۵۰ء) طلیطلہ میں مسیحی مبلغین کی جماعت نے قائم کیا۔ اس مکتب میں عربی، بائبل اور عبرانی اس غرض سے سکھائی جاتی تھیں کہ طلبہ یہودیوں اور مسلمانوں میں تبلیغ مسیحیت کا کام کرنے کے ماہر ہوجائیں۔ اس مکتب نے جو سب سے بڑا محقق پیدا کیا وہ ریمنڈ مارٹن تھا جو سینٹ ٹامس کا معاصر تھا۔ عرب مصنفین کی کتابوں کا عالم ہونے کی حیثیت سے یورپ میں اس کا مثل و نظیر آج تک پیدا نہیں ہوسکا۔ وہ صرف قرآن و حدیث کا عالم ہی نہ تھا۔ بلکہ اپنی کتابوں میں جا بجا الفارابی سے لے کر ابن رشد تک اعلام کے جلیل القدر فلاسفہ و علمائے الٰہیات کے اقتباسات نقل کرتا ہے۔ اور اختلاف کرنے کی صورت میں ان پر تنقید بھی کرتا ہے۔ (The Legacy of Islam, p. 272-273)۔ (۷۲) The Legacy of Islam, p. 273 ۔ (۷۳) دیکھیے: George Makdisi, The Rise of Colleges, p.292 ۔ (۷۴) دیکھیے: The Legacy of Islam, p. 242-243 ۔ (۷۵) شبلی نعمانی، مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، قومی پریس، لکھنؤ، ۱۸۸۸ء، ص ۷۸۔ (۷۶) **تاریخ الجامعات الاسلامیہ الکبری** ، ص ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ (۷۷) جلال ہمائی، غزالی نامہ، ص ۱۴۸۔ (۷۸) **تاریخ الجامعات الاسلامیہ الکبری** ، ص ۳۸۱۔ (۷۹) (Norman Denial, "Islam and the West (The Making of an image, Edinbara University Press, 1960, p.216) ۔ (۸۰) **تاریخ الجامعات الاسلامیہ الکبری** ، ص ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ (۸۱) ایضاً، ص ۴۴۸۔

بریلی میں اردو شاعری کا ارتقاء

(۱۷۴۹ء تا ۱۹۴۹ء)

سید لطیف حسین ادیب

(۳)

(سلسلہ کے لیے اپریل کا شمارہ دیکھیں)

شفیع احمد عیشؔ (م ۱۹۴۷ء) تلمیذ داغؔ نے صرف داغؔ کے طرز سخن کا اتباع کیا اور اس کی حینِ حیات تنہا اس کے دم سے داغؔ کا رنگ تغزل بریلی میں مروج رہا۔ اس کا نمونۂ کلام مندرجہ ذیل ہے۔

اِدھر آئے وہ لو اُدھر گئے، رہیں رات بھر، یہ محال ہے
مجھے پردہ داری کا پاس ہے، انہیں آبرو کا خیال ہے

تم جن پہ سو سناؤ وہ عرضِ وصال ہے
دل جس کو مان لے وہ تمہارا سخن ہوا

میں کیا بتاؤں ذوقِ تصور کی انتہا
لپٹا ہوا وہ ہاتھ ابھی تک کمر سے ہے

آپ کیوں روتے ہیں، کیوں سوگِ عدو کرتے ہیں
آپ کیوں اُٹھتی جوانی کا لہو کرتے ہیں

عیشؔ بھر آتا ہے واعظ کے بھی منہ میں پانی
جب کبھی تذکرۂ جام و سبو کرتے ہیں

---

۴۳ پھول والان، بریلی (یوپی) ۲۴۳۰۰۳۔

یہ منظر حاصلِ عمر محبت ہے خدا رکھے
کہ ان کے ہاتھ میں نبضیں ہیں اور ہم مرنے والے ہیں

یا رب اسی طرح میری میت پڑی رہے
بیٹھے رہیں وہ بال پریشاں کیے ہوے

عیش کا یہ انداز غزل عوام اور مشاعروں میں بہت مقبول ہوا۔

بیسویں صدی عیسوی کے پہلے ربع میں اردو شاعری کا بریلی کے قصبات میں بھی زور بندھا۔ امراء اور زمینداروں نے اپنے اپنے قصبات میں شعراء کی سرپرستی کی اور مشاعرے منعقد کیے۔ اس کے علاوہ بریلی کے ملازمین سرکار جب تبادلے پر تحصیلی قصبات میں گئے تو ان میں جو شاعر تھے انہوں نے وہاں سخن سنجی کی اور تلامذہ تیار کیے۔ آنولہ۔ فرید پور۔ بہٹری۔ رچھا اور موی قاضیان وغیرہ میں شعروشاعری نے فروغ پایا۔ گلدستۂ نہال سخن بریلی جس کا تعلق بیسوی صدی عیسوی کی دوسری دہائی سے ہے اس معنی میں تاریخی حیثیت کا حامل ہے کہ اس میں جتنا شعرائے بریلی کا کلام چھپا وہ ان کے دواوین کی عدم موجودگی میں بہت کام آیا ورنہ اس عہد کے شعراء کے اسماء تو معلوم ہوتے کلام نہیں ملتا۔ قاضی محمد خلیل حیراںؔ نے ۵؍اور ۶؍نومبر ۱۹۱۱ء کو اپنے مکان واقع پل قاضی بریلی پر کل ہند مشاعرہ کرایا جس کی کامیابی نے بریلی میں شعروشاعری کی اشاعت کی۔ مختصر یہ کہ اس زمانے میں بریلی میں شعروشاعری کی بدستور گرم بازاری تھی اور اساتذہ اپنے اپنے رنگ تغزل کو فروغ دینے میں کوشاں تھے۔

بیسوی صدی عیسوی کے پہلے ربع میں انگریزی تعلیم کا رواج بڑھا اور انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ سرکاری ملازمتوں سے منسلک ہوا۔ اس طبقے کے فروغ کے ساتھ متوسط طبقے نے ترقی کی۔ زیادہ تر شاعر سرکاری ملازم۔ تجارت پیشہ۔ ہنرمند اور چھوٹے مال گذار تھے۔ جنگ عظیم اول نے اور اردو وانگریزی کے اخبارات نے تعلیم یافتہ طبقے کو ملکی اور بین الاقوامی معاملات سے آگاہ کیا۔ گاندھی جی کی ہندوستان میں آمد سے کانگریس پارٹی کا زور بندھا اور آزادیٔ وطن کی تحریک میں تیزی آئی۔ سرسید احمد خاں کی تعلیمی تحریک کا بھی مثبت اثر ہوا۔ بریلی میں ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۹ء میں سرآغا خاں اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی قیادت میں تعلیمی مشن آیا۔ اسکول قائم ہوا جو اس

وقت اسلامیہ انٹر کالج بریلی ہے۔ بریلی کے ہی ایک مورخ اور ماہر تعلیم سید الطاف علی نے تعلیم نسواں کے لیے لڑکیوں کا اسکول قائم کیا جو اس وقت اسلامیہ گرلس انٹر کالج ہے۔ ان کے علاوہ آریہ سماج بریلی نے سرسوتی ودیالہ اور عیسائی پادریوں نے مشن اسکول کھولے۔ میدان سیاست میں کرانت کاری دامودر سروپ سیٹھ نے ہارڈنگ بم کیس (۱۹۱۱ء) بنارس سازش کیس۔ عدم تعاون تحریک۔ کاکوری سازش کیس (۱۹۲۶ء)۔ نمک اندولن۔ ہندوستان چھوڑو اندولن میں حصہ لیا اور مجموعی طور پر لگ بھگ سترہ برس قید با مشقت میں گذارے۔ مولوی عبدالودود دردؔ ماہر تعلیم اور نیشنلسٹ تھا۔ مذکورہ بالا اسلامیہ انٹر کالج اور اسلامیہ گرلس انٹر کالج کی تاسیس میں اس کا بھی ہاتھ تھا۔ اسلامیہ گرلس اسکول بریلی اس کی کوٹھی ''رین بسیرا'' میں ہی قائم ہوا۔ مولوی عبدالودود دردؔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ممبر تھا۔ اس نے بریلی میں کانگریس پارٹی کی تنظیم کی۔ اس نے خلافت اور تحریک عدم تعاون کے زمانے (۲۰-۱۹۲۱ء) میں اٹھارہ ماہ جیل میں قید با مشقت میں گذارے۔ ایسا نہیں تھا کہ اس عہد کے غزل گویان بریلی انگریز کے استبداد۔ محبان وطن کی مظلومیت۔ ملک کی اقتصادی بدحالی اور عدم مساوات وانصاف سے ناواقف تھے اور ان کے دل پر چوٹ نہیں لگتی تھی۔ دراصل طبقہ بالا حکومت نواز تھا۔ طبقہ متوسط کو روزی روٹی عزیز تھی جس کی وجہ سے وہ لب کشائی سے قاصر تھا۔ نچلا طبقہ اپنے نصیب پر قناعت کر چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شعرائے بریلی کی اتنی بڑی بھیڑ میں غزل اپنے روایتی مضامین پر قائم رہی۔ خود مولوی عبدالودود دردؔ نے غزل کو منہ نہیں لگایا۔ پریم شنکر ثمرؔ جس نے ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی کی قیادت قبول کی، ۱۹۲۰ء میں پوسٹ آفس کی ملازمت سے استعفا دیا۔ ۱۹۲۲ء، ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں تین بار جیل گیا، اس نے بھی اپنی غزل میں روایتی مضامین قلم بند کیے۔ البتہ عبدالودود دردؔ کی نظموں میں عصری بصیرت ملتی ہے۔ اس نے سیاست۔ اصلاح معاشرہ اور نیچر پر نظمیں تحریر کیں جو اس کے مطبوعہ کلام مسمی درد و انبساط میں شامل ہیں۔ اشاعت منظومات خود اپنی جگہ اہم بات تھی۔ بریلی کی شاعری میں منظومات کی کمی محسوس کی جارہی تھی۔ دردؔ کے علاوہ شیام موہن لال جگر بریلوی کی نظم ''پپیہا اور پی کہاں'' شائع ہوئی۔ اشفاق حسین صدیقی کی نظم ''کویلیا'' اور سجاد حسین ناطقؔ کی نظم ''نینی تال'' منظر عام پر آئیں۔ بریلی میں نظم نگاروں کا پیدا ہونا مبارک ومسعود تھا۔ عشقیہ

شاعری کے ساتھ رومانٹک شاعری کا آغاز ہوا جس میں عصری شعور کی نمو موجود تھی۔

بیسوی صدی عیسوی کے ربع اول کے نعت گویان بریلی میں اہم ترین شاعر جمیل الرحمٰن خاں جمیلؔ (م ۱۹۲۵ء) تلمیذ حسن رضا خاں حسنؔ تھا۔ اس نے صرف نعتیہ شاعری کی۔ اس کا مجموعہ کلام نعت مسمی قبالۂ بخشش ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔ اس کی نعتوں میں وہی مٹھاس۔ گھلاوٹ اور والہانہ پن ہے جو اس کے استاذ کے نعتیہ کلام کے اوصاف ہیں۔ اس کی دو نعتیں بہت مشہور اور مقبول ہوئیں جن کے مطالع مندرجہ ذیل ہیں۔

وہ حسن ہے اے سیدِ ابرار تمہارا اللہ بھی ہے طالب دیدار تمہارا

حمد ہے اس ذات کی جس نے مسلماں کر دیا عشق سلطانِ جہاں سینے میں پنہاں کر دیا

اس زمانے میں قصیدہ نگاری ختم سی ہوگئی۔ اکبر حسین صولتؔ (م ۱۹۱۳ء) کا ایک غیر مطبوعہ نعتیہ قصیدہ مسمی خزینۃ البرکات ضرور ہمدست ہوا جو راقم الحروف نے ماہنامہ قومی زبان کراچی بابت نومبر ۱۹۶۶ء میں شائع کرادیا تھا۔ یہ قصیدہ محسن کاکوروی کی نظم دل افروز (۱۹۰۱ء) کی زمین میں ہے۔ اس کا مطلع ہے۔

رواں ہے آبِ گوہر قلزمِ طبعِ سخنور میں
کہ لہریں لے رہے ہیں ہفت قلزم آبِ گوہر میں

اس دور میں واسوخت اور مراثی نہیں ملے۔ مراثی کی جگہ حسب روایت ذکر شہادتین اور امام حسینؑ کی مدح میں مناقب ملتے ہیں۔

حسن اتفاق کہ اس زمانے میں ایک ریختی گو محمد محسن نظر پڑا۔ ریختی میں اس کا تخلص عنقا بیگم تھا۔ اس کا مجموعہ ریختی مسمی رنگیلی بیگم ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا۔ اس کا ایک شعر ریختی مندرجۂ ذیل ہے۔

پھرتا ہے موا پیچھے مرے سایہ کی صورت
درگاہ گئی واں بھی نگوڑا نظر آیا

اس زمانے میں مثنوی نگاری کا چلن بھی کم ہوگیا۔ حسن رضا خاں حسنؔ نے تین نعتیہ مثنویات تحریر کیں جن کے نام ہیں مثنوی وسائل بخشش۔ ذکر ولادت شریف۔ ایک ناتمام مثنوی۔ ان میں چھ سو دو اشعار پر مشتمل مثنوی وسائل بخشش صنفی خصوصیات کی حامل ہے۔ یہ مثنویاں حسنؔ

کے نعتیہ کلام مسمی ذوق نعت کے ساتھ ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئیں۔

دوسرا مثنوی نگار علی احمد خاں اسیرؔ (م ۱۹۲۷ء) تھا۔ اس سے دو مطبوعہ مثنویاں مسمی شیریں خسرو اور تجلی وصال منسوب ہیں۔

عجیب اتفاق ہے کہ اس زمانے میں ہزل گویان منظر عام پر آئے اور بہت مقبول ہوئے۔ صورت کچھ ایسی تھی کہ اساتذۂ بریلی نے اپنے اپنے ہزل گو تیار کیے تھے۔ حسنؔ نے شجاعت علی خندہؔ کو، عبدالصمد سرشارؔ نے ایک سقّہ کو جس کا تخلص فلفلؔ تھا اور قیصرؔ نے نیاز اللہ خاں ظریفؔ کو۔ یہ ہزل گو مشاعروں میں اپنا طرحی کلام سناتے تھے۔ ان میں خندہؔ کی ہزلیات کے چند اوراق شائع بھی ہوئے۔ فلفلؔ کا نام اور ہزلیات کالعدم ہوگئیں۔ ظریفؔ کی ہزلیات اس عہد کے گلدستوں میں ملتی ہیں لیکن ان میں بدمذاقی اور سوقیت زیادہ ہے۔ البتہ جس ہزل گو اور ہجو نگار نے بامقصد شاعری کی اور شہرت پائی وہ محمد علی خاں ابلیسؔ (م ۱۹۵۳ء) تھا۔ اس نے تحریک خلافت کے زمانے میں شاعری کا آغاز کیا۔ اس نے انگریز نواز امراء شکم پرور پیران طریقت اور علمائے بریلی کے خلاف قلم اٹھایا۔ اس کی مطبوعہ مثنوی مسمی خواب عبرت اور غیر مطبوعۂ ٹامی نامہ نے شہرت پائی۔ خواب عبرت کا نشانہ علمائے بریلی بنے۔ ٹامی نامہ میں کتوں کی تین سو اقسام بیان کرنے کے بعد انگریز نواز عمائد شہر سے یہ پوچھا گیا ہے کہ ان کا تعلق کس قسم کے کتے سے ہے۔ اس کی ایک ہزل جس کا مطلع ہے۔

او بے حیا آخ تھو تری اوقات پر
او کمینے بے حیا آخ تھو تری اوقات پر

بہت مشہور ہوئی۔ اس وقت یہی کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا ہزل گویان کے دم سے شہر میں رونق سخن بڑھی۔

اسی زمانے میں اعتماد الدین احمد عرشؔ (م ۱۹۲۹ء) تلمیذ محو نے رباعیاں لکھیں جو دراصل اس کی جوانی اور نامرادی کا نوحہ ہیں۔ اس کی رباعیات کا انتخاب ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔

بیسوی صدی عیسوی کے ربع ثانی میں بین الاقوامی سطح پر جمہوریت، مارکسزم، نازی ازم اور فاشزم کا شیوع اور باہمی ٹکراؤ۔ ایٹمی توانائی کی دریافت، مہلک ہتھیاروں کی ایجاد، علوم عقلی

کا پھیلاؤ، نئے علوم ونظریات کی تشکیل، ٹیکنالوجی کی ترقی اور جنگ عظیم دوم وغیرہ ایسے اہم معاملات تھے جن کا اثر سارے عالم نے قبول کیا۔ ابلاغ کے ذرائع بڑھے، رسائل اوراخبارات کی تعداد بڑھی، ریڈیو ایجاد ہوا جن سے مسائل کے متعلق واقفیت میں اضافہ ہوا۔ غلام ممالک میں تحریک آزادی میں شدت پیدا ہوئی۔ ہندوستان میں بھی تحریک آزادی تیز تر ہوئی۔ ان امور کا ادب نے اثر قبول کیا۔ قومی ادب کی تشکیل ہوئی۔ شعراء پر مقدمات دائر ہوئے۔ انہیں جیل بھیجا گیا۔ ان کی نظمیں ضبط ہوئیں۔ مطابع سے بھاری ضمانتیں طلب کی گئیں۔ قومی شاعروں کے علاوہ رومانٹک شاعری وجود میں آئی۔ اردو شاعری کے شہری ماحول میں دیہات کا رنگ شامل ہوا۔ معاشرتی اصلاح بھی زبان قلم پر آئی۔ ہیئت کے تجربے بھی ہوئے۔ نظم معرّا، سانٹ وغیرہ اختیار کیے گئے۔ پورے ہندوستان کی طرح یہ سب کچھ بریلی میں بھی ہوا۔

اس وقت بریلی میں دوطرح کے غزل گو تھے۔ ایک قسم ان غزل گویان کی تھی جو مروجہ تغزل میں ندرت و جدت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ دوسری قسم کے وہ غزل گویان تھے جو عصری حالات کے دباؤ میں ان محسوسات کو بھی نظم کرتے جن کا تعلق سیاسی ومعاشرتی معاملات سے تھا۔

بیسوی صدی عیسوی کے ربع ثانی میں بریلی کے محتشم غزل گویان کے اسماء یہ ہیں: سید ہادی علی رواںؔ (م ۱۹۳۳ء)، محمد فاضل عبقریؔ (م ۱۹۳۹ء)، دوارکا پرشاد حلمؔ (م ۱۹۴۰ء)، سردار احمد خاں ناظمؔ (م ۱۹۴۵ء)، رام بہادر لال جویاؔ اور سعادت یار بیگ معجزؔ (م ۱۹۵۰ء)۔ ایسے شعراء جو قومی سیاست سے منسلک تھے اور جن کے اشعار غزل میں ان کا درد بلا ارادہ داخل ہوا یا جو غزل کو حسب روایت لکھتے رہے اور قومی خیالات کا اظہار قومی نظموں میں کیا ان کے اسماء ہیں: نندلال گپتا کیفیؔ (م ۱۹۵۶ء)، ڈاکٹر سعید احمد سعیدؔ (م ۱۹۵۷ء) اور پریم شنکر ثمرؔ جو شاید ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ء کے مابین فوت ہوا۔

سید ہادی علی رواںؔ ابن مولوی قاسم علی خواہاںؔ غزل فارسی اور انگریزی میں مہارت رکھتا تھا۔ شعروشاعری اس کا ورثۂ خاندانی تھا۔ صاحب دیوان تھا۔ اس کی غزل میں بوجہ داخلی حسیت اور رمزیت وقار ومتانت کا خاصہ ہے۔ اس کی غزلیات میں مطلع تا مقطع ایک ہی فضا ملتی ہے جو اس کی فکر مربوط کا ثبوت ہے۔ اس اعتبار سے وہ اپنے معاصرین شعرائے بریلی میں منفرد

نظر آتا ہے۔اس کے طرز غزل کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے ہوسکتا ہے۔

دلِ مرحوم افسانہ ہے میرا ہر ایک عالم میں مری مرگِ جوانی کا کہاں ماتم نہیں ہوتا
گھر میں بیٹھے ہوئے دنیا کی خبر رکھتے ہیں اللہ اللہ یہ نظر اہلِ نظر رکھتے ہیں
ابھی تو ہوش سے باہر ہیں مشتاقِ جمال ان کے جو اُٹھ جائیں حجاب درمیاں برپا قیامت ہو
اب ڈھونڈتا ہے محبتِ یارانِ ہم نشیں وہ دل کہ وجہِ برہمی انجمن ہوا
تقسیمِ جام و خُم میں ہے ساقی کا کیا قصور خود اپنا اپنا ظرف ہے، بیشی کمی کی بات
پہلے تو ہم زبان میں پیدا اثر کریں پھر آرزو کو وقف دعاے سحر کریں
رواؔں پتا یہ چلا انتہائے منزل پر کہ اب یہاں سے چلوں تیری جستجو کے لیے
اللہ اللہ یہ ہے نسبتِ طاعت اپنی ہم نے مجبوریوں کا نام خدا رکھا ہے
رواؔں حاصل ہے فخرِ خاندانی ہے اقلیم سخن جاگیر اپنی

محمد فاضل عبقرؔی کا زیادہ وقت کلکتہ اور جبل پور میں گذرا جس کی وجہ سے اس پر اساتذہ بریلی کے اثرات نہیں پڑے۔اس کی غزلیات میں جوش ولولہ اور شوکت الفاظ و بیان کا خاصہ ہے جو بالعموم غزلیات میں نہیں ملتا۔اس کے اعصاب پر ملت کی زبوں حالی سوار تھی۔اسی وجہ سے اس کے اشعار غزل میں اخلاقیات کے مضامین اور طنز کا عنصر ملتا ہے جن کی موجودگی میں اس کی غزل علاحدہ پہچانی جاسکتی ہے۔مثلاً۔

حق حق پکار دور انا الحق گذر گیا جوشِ جنوں کو رہنے دے دار و رسن سے دور
رندوں میں اور شیخ میں اللہ رے امتیاز دنیا فروش یہ ہیں وہ عقبی فروش ہے
بزم عالم میں وہ ہم رندِ شکستہ دل ہیں مے بھی پیتے ہیں تو ٹوٹے ہوئے پیمانوں سے

دوارکا پرشاد حلم تلمیذ حسن رضا خاں حسؔن نے ایک ایسے دور شاعری میں جب کہ بریلی سے زلف و کمر اور واقعات و محاکمات پر مبنی تغزل رخصت ہو رہا تھا، داغؔ کے طرز سخن کی تقلید و توسیع کی اور وہ اسی رنگ تغزل میں مشہور ہوا۔اس کی وفات کے بعد یہ طرز سخن بھی بریلی سے رخصت ہوگیا۔اس کے دو اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

یہ مانا دید کے قابل کسی کی بزم رنگیں ہے مگر اے دل وہاں اپنا تو مشکل ہے گذر ہونا

کسی نے شرم سے گردن جھکالی جو ہم نے تذکرہ چھیڑا کہیں کا

سردار احمد خاں ناظم تلمیذ مفتی عماد الحسن محو ایک فطری غزل گو تھا۔ اس نے اپنی غزل میں اپنے احساس نامرادی کو اتنا ابھرا کہ وہ پورے شہر کا الم معلوم ہونے لگا۔ اس نے مدت العمر غم کا کفن اپنے زندہ جسم پر ڈالے رکھا۔ البتہ اس نے جس سلیقے سے غزل گوئی کی اس کا جواب نہیں۔ شدت احساس اور جذبات الم کی لہو رنگ شاعری جس میں موت کا سکوت اور قیامت کی ہولنا کی شامل تھی اپنے رنگ سخن میں کم سے کم بریلی میں منفرد اور بے مثال ہے۔ اس کے تغزل کا مندرجہ ذیل اشعار سے اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

کیا کہوں میں اپنی اس پھوٹی ہوئی تقدیر کو مَے کا ساغر بھی دیا ساقی نے تو ٹوٹا ہوا

دنیا کی نصیحت سے تنگ آ کے یہ کہتا ہوں دنیا کے عذابوں سے عقبٰی کا عذاب اولیٰ

احباب نے بھی چھوڑ دیا بیکسی میں ساتھ اپنا شریکِ حال فقط ایک غم ہوا

ہم نے مزے اٹھائے کچھ بھی نہ زندگی کے روتے کٹے ہیں وہ بھی جو دن کہ تھے ہنسی کے

عمر اپنی کٹی مصیبت میں عیش سے دو گھڑی بسر نہ ہوئی

چاہا کہ میسر ہو سامان طرب ناظم ہرگز یہ نہیں ممکن یہ شہر بریلی ہے

شعر کہنا اب نہیں ہے حظ اٹھانے کے لیے کہہ لیا کرتے ہیں کچھ رونے رلانے کے لیے

ناظم مفتیان بریلی کے طرز سخن کا پابند تھا جو باطبع غم و الم کی شاعری کے دلدادہ نہیں تھے۔ چنانچہ ناظم نے مفتیان کے زیر اثر اور ان کے مشاعروں میں پڑھنے کے لیے جو غزلیات تحریر کیں ان کا اسلوب سخن مندرجہ ذیل تھا اور حقیقت یہ ہے کہ خوب تھا ۔

اس دن کو موت آئے جو وہ بے قرار ہو ہے ہے خدا نہ کردہ جو نالے اثر کریں

بندہ نواز آپ نہ دیکھیں اٹھا کے آنکھ دنیا کا راز آپ کی نیچی نظر میں ہے

اپنا یہی شراب کی نسبت خیال ہے عقبٰی میں جب حلال ہے اب بھی حلال ہے

کھلے بندوں ملو بے باک ہوکر حیا کے ساتھ ملنے میں مزا کیا

آنکھ کس کس سے سرِ بزم لڑائی نہ گئی اس حیا پر ترے دیدے کی صفائی نہ گئی

رام بہادر لال جویاؔ کے سینے میں قومی درد تھا جس کا اظہار اس کی نظموں میں ہوا۔ اس

کی غزلیات میں فکری سنجیدگی ملتی ہے۔ جو عشقیہ شاعری کی مروجہ ایمائیت سے گریز کی علامت بنی۔ مثلاً ؎

آخر اس کشمکش عذر میں ٹوٹا تو کوئی دل مضطر ہی سہی آپ کا پیاں نہ سہی
زمیں پر جب پڑا سایہ تو ہر سایہ برابر ہے امیروں کے دوشالے کا ہو یا مفلس کے کمبل کا

رام بہادر لال جوؔیا کے ہندو تلامذہ کثرت سے تھے، جن کی وجہ سے ہندوؤں میں غزل کی مقبولیت بڑھی۔

مرزا سعادت یار بیگ معجزؔ خلف مرزا رستم یار بیگ قیصرؔ اپنے خاندان کا بہترین غزل گو تھا۔ اس کے اشعار میں ذہانت، شوخی اور اخلاقی اقدار سے آگہی ملتی ہے۔ اس کو مضمون طرازی اور تخیل آرائی سے بھی دلچسپی تھی ۔ اس کی زبان شعر سوقیت و خارجیت سے عاری ۔ بے عیب ذہانت سے لبریز اور شوخ ہے۔ اس کے انداز سخن کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے ہوسکتا ہے ؎

جب چاہا باغِ حسن سے کچھ پھول چن لیے خالی کبھی نگاہ کا داماں نہیں رہا
نہیں اچھا کسی کا دل دکھانا لرز جاتا ہے اس سے آسماں تک
ڈھانپ کر منہ کو دوپٹے سے وہ بولے شبِ وصل اسی پردے سے عیاں صبحِ قیامت ہوگی
وہ بے حجاب ہوں نہ ہوں ہے ایک سا مجھے اتنی امید تو نگہِ پردہ در سے ہے
دام گیسو سے حسینوں کے بچانا اللہ دستِ فریاد کو ہم طوقِ گلو کرتے ہیں
مرحلہ عشق کا بس عشق سے طے ہوتا ہے یہ وہ منزل ہے کہ خود راہ نما ہوتی ہے
منزل پہ پہنچ جاتے ہیں یہ سر کو جھکا کے انداز ہیں یکساں فقراء و شعراء کے

معجزؔ کے ساتھ ہی فکر آمیز شوخ تکلم کی روایت بھی ختم ہوگئی۔

نند لال گپتا کیفیؔ تلمیذ شفیع احمد عیشؔ قوم پرست ۔ محبّ وطن اور کانگریسی تھا۔ اس کا اپنا شنگل پریس تھا جس میں انگریزوں کے خلاف لٹریچر بھی طبع ہوتا تھا۔ اس کا گلدستۂ ترانۂ وطن اسی پریس سے شائع ہو کر ضبط ہوا۔ اس نے غزل کو روایتی ڈھنگ پر لکھا لیکن قوم پرستانہ خیالات کا اظہار کرتے وقت اس نے غزل کی ہیئت استعمال کرنے کے باوجود غزل کی لفظیت اور ایمائیت سے حذر کیا۔ مثلاً ؎

ستم ہم پہ یہ کیا کیا بانیٔ بیداد کرتے ہیں
کہ نامی لیڈروں سے جیل کو آباد کرتے ہیں

اگر تحریک آزادی کی ان غزلیات کو دیکھا جائے جو ضبط ہوئیں تو ان کا طرز ایسا ہی ہے۔ ان غزلیات کا انداز اشتہاری تھا اور ان کا مقصد عام لوگوں میں روح آزادی کو پھیلانا تھا۔ تغزل غایت و مقصد نہیں تھا۔

ڈاکٹر سعید احمد سعیدؔ باعتبار پیشہ فزیشین اور سرجن تھا۔ اس نے جنگ عظیم اول میں فرانس میں فوجی خدمت انجام دی۔ بعد جنگ دہلی پہنچا اور علی برادران حکیم اجمل خاں۔ آصف علی اور ڈاکٹر انصاری کے ساتھ آزادی کی تحریک میں شامل ہوگیا۔ فوجی ملازمت پر جانے سے پہلے مولوی قاسم علی خواہاںؔ کا شاگرد ہوا۔ اس کا زیادہ وقت قرول باغ دہلی میں گذرا، ۱۹۴۸ء میں بریلی آیا۔ صاف ستھری زبان میں غزلیں لکھتا جن میں روایتی عاشقانہ مضامین بہت کم ہوتے تھے۔ اس کی غزلیات بریلی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے میں مقبول تھیں۔ جو لوگ اس کی سیاسی زندگی سے واقف تھے اس کی غزل کی رمزیت کو سمجھ کر داد دیتے تھے۔ اس کی بیاض شاعری ہمدست نہیں ہوئی۔

پریم شنکر ثمرؔ ۱۹۱۹ء سے مرتے وقت تک کانگریسی رہا۔ پوری زندگی مصائب میں گذاری۔ تین بار جیل گیا اور آزادیٔ وطن کے بعد بھی صبر و قناعت کے ساتھ زندگی گذاری۔ اس نے بھی غزل کو غزل ہی سمجھا اور مروجہ اسلوب میں غزل گوئی کی لیکن اس کے مصائب اور نامرادی کا کرب اس کے اشعار میں محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً ؎

کس سے کہیں سنائیں کسے حال دل ثمرؔ
ہم بیکسوں کا کوئی بھی پرساں نہیں رہا

زیست کے پردے میں سنتے ہیں فسانہ موت کا
اے ثمرؔ اس ابتدا میں انتہا موجود ہے

اس نے دنیا کی داد بے داد سے چشم پوشی کر کے الگ تھلگ زندگی گذار دی۔ اس کے کمال سخن گوئی میں کوئی شبہ نہیں۔

بریلی میں بیسویں صدی عیسوی کے ربع ثانی میں نظم نگاری نے مستقل حیثیت اختیار کی۔

نظمیات کے چار موضوعات تھے۔ ۱- قومی و اصلاحی ۲- رومانٹک ۳- طنزیہ ۴- بچوں کے لیے۔

قومی نظموں کے بیشتر عنوانات کا تعلق قومی لیڈروں سے تھا جن کے کارہائے نمایاں کے ذریعہ جوش و ولولہ پیدا کیا جاتا۔ یہ نظمیں قومی اخبارات میں شائع ہوتی تھیں۔ ایسے نظم نگاروں میں رام بہادر لال جویاؔ، ڈاکٹر سعید احمد سعیدؔ، نند لال گپتا کیفیؔ اور پریم شنکر ثمرؔ مشہور ہوئے۔ اصلاحی منظومات محمد فاضل عبقری اور تبارک علی عبرتؔ صدیقی نے تحریر کیں۔ عبقریؔ نے حالیؔ کا اور عبرتؔ نے اقبالؔ کا اثر قبول کیا۔ اول الذکر چاروں شعراء کی نظمیں شائع نہیں ہوئیں۔ عبقری کی نظمیں اس کے مطبوعہ دیوان میں شامل ہیں۔ صور قیامت ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی۔ عبرت صور قیامت کی اشاعت کے بعد باون برس زندہ رہا لیکن اس نے زلف غزل کو ہی بصد شوق سنوارا اور نظم نگاری کو منہ نہیں لگایا۔ اصلاحی نظموں کے سلسلے میں شیام موہن لال جگرؔ بریلوی (م ۱۹۷۶ء) کے ایک سو چھتیس بندوں پر مشتمل کائستھ درپن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس کی طباعت کی نوبت ۱۹۵۳ء میں آئی۔ کائستھ درپن حالیؔ کے مسدس مد و جزر اسلام کے فریم میں ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ حالی کا مخاطب مسلمان ہیں اور جگر بریلوی کا کائستھ۔

رومانٹک نظموں کا کینوس قومی و اصلاحی نظموں کے کینوس سے بڑا تھا۔ رومانٹک نظموں میں ہر موضوع کی سمائی تھی۔ نظم نگار کو اپنے احساس، جذبے اور تخیل کو نظم کرنے کی آزادی تھی۔ رومانتک شاعری نے جمالیات کا نیا باب کھولا۔ نمونے کے لیے انگریزی زبان کے شعراء کی نظمیں اور خود اردو میں جوش ملیح آبادی جیسا شعلہ و شبنم شاعر موجود تھا۔ رام بہادر لال جویاؔ نے نظمیں لکھیں جن کو اس کے شاگرد سیوتی پرشاد صہبائیؔ بدایونی نے مرتب کر کے شائع کرانا چاہا لیکن صہبائی کی موت کی وجہ سے یہ کام نہیں ہو سکا۔ مسودہ بھی ناپید ہو گیا۔ شیام موہن لال جگرؔ بریلوی نے ''نور و سرور'' کے نام سے اپنی نظموں کو مرتب کیا جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ تجمل حسین اختر نے اپنی رومانٹک نظمیں بعنوان ''آگ پانی'' مرتب کیں جو اس زمانے کے طرز نظم گوئی کے مطابق رومان پرور ہیں۔ مثلاً اس کی مشہور نظم ''رام گنگا'' کے مندرجہ ذیل اشعار جوش ملیح آبادی کی نظم ''جنگل کی رانی'' کی یاد دلاتے ہیں ؎

خورشید نہ چمکا تھا مگر ماند تھے تارے اک ماہ رو وارد ہوئی گنگا کے کنارے

کاکل میں لیے شام اودھ کی سی سیاہی عارض میں لیے صبح بنارس کے نظارے
بالوں سے وہ پانی کے ڈھلکتے ہوئے موتی جیسے کہ سمندر میں گریں ٹوٹ کے تارے
معصوم جوانی میں بھری حسن سے معمور نظروں کو جھکائے ہوئے سینے کو ابھارے

بلقیس جمال جمآلہ کی نظموں کے دو مجموعے شائع ہوئے جن کے نام ہیں آئینۂ جمال اور قوس قزح۔ جمآلہ جوانی میں بیوہ ہوئی۔ اس کو اپنے شوہر سے بہت محبت تھی۔ شوہر کی وفات سے اس پر جنون طاری ہوگیا۔ وہ تمام عمر اپنے شوہر کو تلاش کرتی رہی جو نہیں تھا۔ بقول اس کے ؎

نہیں ہے جو اس کو ڈھونڈتی ہوں
جمآلہ اس جنوں سے فائدہ کیا

اس کا شوہر سے جدائی کا غم اس کی نظموں میں ابھرتا رہا چاہے وہ نظمیں کسی بھی موضوع پر ہوں۔ مثلاً نظم ''پروانہ'' کا مندرجہ ذیل بند اس کے ہی غم کا عکاس ہے ؎

فزوں ہے سوزشِ جگر دہک رہے ہیں بال و پر
نظر اٹھا ، اٹھا نظر ہے شمع تیری منتظر
لگی ہے آگ سربسر
سلام ! عمرِ مختصر

جمآلہ کی نظمیں جذباتی اور رواں دواں ہیں۔

جمآلہ کی بڑی بہن سپہر آرا پنہاں جس کا رابعہ تخلص بھی تھا (م ۱۹۸۰ء) اصلاً فارسی گو تھی۔ اس کی رومانتک نظموں میں حسن الفاظ اور بندش الفاظ کے چمکدار نگینے ملتے ہیں۔ تخیل طرازی بھی کمال پر ہے۔ اس کی نظم ''شب ماہ'' کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں ؎

ہے بساط سبزۂ رنگیں جواب آسماں سرد اور شفاف قطرے ہیں گلوں پر دُر چکاں
نازنیں پودوں کی شاخیں بے خبر سی محو خواب جھک گئی ہے نیند سے نرگس کی چشم سیم تاب
ہے ردائے نور میں ملفوف نظم کائنات ایک سنجیدہ سکوں میں غرق بزم شش جہات
غرق بحر نور میں ہے دامن بزم فلک پڑ گئی پھیکی کواکب کی ضیا افشاں جھلک
چشم نازاں کا تموج نازش تنویر ہے خندۂ لب ہائے رنگیں کیف کی تفسیر ہے

پنہاںؔ اور جمالہؔ کی نظمیں ماہنامہ نیرنگ خیال وغیرہ میں بھی شائع ہوتی تھیں۔

اشفاق علی خاں شائقؔ نے انگریزی اور ہندی ادب سے استفادہ کیا۔اس نے سانٹ اور گیت لکھے جو صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیے۔وہ بریلی کا پہلا سانٹ اور گیت نگار ہے۔

تجمل حسین اخترؔ جہاں رومانتک نظم نگار تھا وہاں ایک ناراض نوجوان بھی جس نے طنزیہ نظمیں لکھیں جو اس کے مطبوعہ مجموعہ نظمیات مسمی پس پردہ میں شامل ہیں۔اس کی نظموں کا موضوع میونسپل بورڈ بریلی۔بریلی کی سڑکیں۔بریلی کے مشاعرے۔بریلی کے شعراء وغیرہ ہیں۔یہ منظومات اس وجہ سے بھی اہم ہیں کہ ان کے ذریعہ ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۷ء کے مابین بریلی کی جو شہری حالت تھی، وہ سامنے آجاتی ہے۔اس نے نظم ''بادۂ تلخ'' میں شعرائے بریلی کے متعلق تحریر کیا ؎

اس علم خیز شہر میں شاعر ہیں بے شمار — مغرور یاوہ گو سخن آزاد ہرزہ کار
فن سے غرض نہ علم سے زنہار بہرہ ور — کم عقل بد دماغ غلط فہم و بے ہنر
عمریں گذر گئی ہیں سخن کے مذاق میں — لیکن پڑے ہوئے ہیں ابھی تک مراق میں

اس نے اساتذۂ فن کے متعلق لکھا ؎

استاد بن گیا ہے ہر اک حرف آشنا — خود بین و خود پرست و خود آرا و خود ستا
جدت سے ہیں نفور تو تقلید کے ہیں مرد — بازار شاعری کا ہوا، ان کے دم سے سرد
علامہ بن گیا ہے کوئی جاہل زماں — ہوتا ہے جس کو دیکھ کے شیطان کا گماں
استاد ہے ہر ایک، ہر اک ہے مہاکوی — جی چاہتا ہے خود کو نہ لکھوں بریلوی

اس نے مشاعروں کے متعلق تحریر کیا ؎

اس پست ذہنیت کے ہوں شاعر جہاں ہزار — کس طرح ہوں مشاعرے اس جا ستودہ کار
داد اس ادا سے دیتے ہیں محفل کے ژاژ خائے — جیسے کہ کرب میں کوئی کرتا ہو ہائے ہائے
آوازے خوب کستے ہیں مسند نشین پر — چلاتے چیختے رہتے ہیں رات بھر
چلتی ہیں لاٹھیاں بھی یہاں بات بات پر — حملے یہاں بھی ہوتے ہیں ذات وصفات پر
القصہ ہے رذیلوں کا میلہ مشاعرہ — اس شہر میں ہے ایک جھمیلہ مشاعرہ

اس وقت شعراء کی بھیڑ اور مشاعروں کی کثرت میں دو ایک مشاعروں کی خفیف الحرکاتی

اور دو چار مشاعروں میں لاٹھی بازی فن شریف کے خلاف ہونے کے باوجود ناممکن نہیں تھی۔ ابھی ان مشاعروں کے شرکاء زندہ ہیں۔ ان مشاعروں میں چوری کی غزل پڑھنے والوں (جنھیں ''عیدی خواں'' کہا جاتا تھا) کی درگت بنتی تھی (جس کو ''عرس'' کہا جاتا تھا)۔ کئی عیدی خوانوں کے یادگار عرس ہوئے اور مشاعرے میں لاٹھی بھی چلی۔ حیف وہ بھی ایک دور تھا جو گذر گیا۔

اس ربع میں بچوں کے لیے بھی منظومات لکھی گئیں۔ اس طرف ڈاکٹر سعید احمد سعید نے بطور خاص توجہ دی۔ ان کی نظمیں ماہنامہ پیام تعلیم اور پھول وغیرہ میں شائع ہوتی تھیں۔ شیام موہن لال جگر نے بھی چالیس صفحات پر مشتمل ایک مجموعۂ نظمیات مسمی کلیاں مرتب کیا۔

اسی زمانے میں کل ہند سطح پر قطعہ نگاری کو عروج ملا اور اختر انصاری جیسے قطعہ نگار اردو میں پیدا ہوئے۔ بریلی میں تجمل حسین اختر نے ایک مجموعہ قطعات بعنوان ستارے مرتب کیا۔ قطعہ نگاری کے عروج سے رباعی نگاری کو زوال ہوا۔ پھر بھی شیام موہن لال جگر نے رباعیاں لکھیں اور ان کو ''رس'' کے نام سے مرتب کیا۔ ''رس'' کی اشاعت ۱۹۶۱ء میں ہوسکی۔ بلدیو پرشاد سوزن (م ۱۹۶۶ء) نے بھی صدہا رباعیات تحریر کیں لیکن عمر کے آخری ایام میں جب اس پر دیوانگی طاری تھی، اس کی رباعیات ضائع ہوگئیں۔

بریلی میں شاعری کے ایسے ہمہ رنگ اور نامیاتی ماحول میں سلسلۂ نعت گوئی جاری رہا۔ علی حسین شاہ طالب (م ۱۹۴۵ء)، نیاز اللہ خاں ظریف (م ۱۹۴۹ء)، محمد فاضل عبقری (م ۱۹۳۹ء) اور حمید اللہ خاں حمید اس ربع کے مشہور نعت گو تھے۔ ان میں عبقری نے مروجہ مضامین نعت سے گریز کر کے نعت کو بغرض اصلاح استعمال کیا۔ ہیئت کا بھی تجربہ کیا۔ لیکن اس کا انداز نعت گوئی مقبول نہیں ہوا۔ بریلی میں نعت گوئی ایک ایسی روایت بن چکی ہے جس کے مضامین اور فارم سے آج بھی گریز ممکن نہیں ہے۔

اس عہد شاعری میں بریلی میں قصیدہ مرثیہ ریختی اور واسوخت نہیں ملے۔ مثنوی نگاری کی روایت شیام موہن لال جگر نے قائم رکھی۔ اس کی مثنویات مسمی رنگ و بو، کرشن سداماں اور بسنتی روداد شائع ہوچکی ہیں۔ یہ مثنویات مختصر ضرور ہیں لیکن ان کا مواد قدیم سنسکرت کہانیوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ایک اخلاقی مقصد رکھتا ہے۔ بریلی میں مثنویات کے دوسو برس کے

ارتقاء کو دیکھتے ہوئے یہ مختصر مثنویاں بہت اہم معلوم ہوتی ہیں کیونکہ ان میں نہ شاہزادے شاہزادیوں کے عشق کی داستان ہے اور نہ فوق فطرت عنصر کی کارفرمائی۔ان مثنویات کی زبان بھی بہت سلیس اور رواں ہے۔

ہندوستان آزاد ہوا۔دو مملکتیں وجود میں آئیں ۔ بڑے پیمانے پر افراد نے ترک وطن کیا۔جو لوگ ہندوستان سے گئے،اپنے ساتھ سرمایۂ کتب بھی لے گئے۔جو سرمایہ فروخت ہوسکتا تھا،وہ ردی کے مول بیچ دیا۔جو سرمایہ رہ گیا،اسے دیمک نے چاٹا۔جب اساتذۂ فن گئے تو مکمل خلا پیدا ہوا۔بریلی میں شعروشاعری کی یہ حالت اسی طرح تھی جیسے ۱۷۷۱ء میں جنگ سکرتال، ۱۷۷۴ء میں روہیلوں کی شکست اور ۱۸۵۷ء میں بریلی پر انگریزوں کے قبضے کے بعد پیدا ہوئی تھی ۔محفل سخن اجڑ گئی ۔مشاعرے بند ہوگئے ۔ترک وطن کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔شہر کہنہ بریلی سے سعادت یار بیگ معجزؔ گیا جس کے جانے سے شہر کہنہ کی شاعری میں تعطل پیدا ہوا۔نیا شہر بریلی سے مفتی صابر حسن شیواؔ عثمانی گیا۔اس کے جانے سے نیا شہر کی بزم سخن اجڑ گئی ۔سعادت یار بیگ معجزؔ بٹوارے کے تین برس بعد لاہور میں فوت ہوا۔شیواؔ عثمانی نے کراچی میں غزل خوانی کی ۔وہ جب تک بریلی میں رہا اپنے خاندان کی روایت شاعری کو سختی سے پکڑے رہا۔اس کی دقت نظر کی شہرت تھی ۔کراچی میں احساس غریب الوطنی اور تنہائی نے اس کا دیرینہ خولِ شاعری توڑ دیا اور اس نے ایسے دلنشیں اشعار لکھنے کی روش اختیار کی ؎

دل نے جب عشرتِ ماضی کا فسانہ چھیڑا اپنے گذرے ہوئے لمحات پہ رونا آیا
جام منہ دیکھ کے دینے کی یہاں رسم نہ تھی بدعتِ پیرِ خرابات پہ رونا آیا
کچھ ہنسی آئی زمانے کی روش پہ شیواؔ کچھ بدلتے ہوئے حالات پہ رونا آیا

شیام موہن لال جگرؔ نے آزادیٔ وطن کے وقت ایک شاعر اور ایک غزل گو کی حیثیت سے احتشام حاصل کرلیا تھا۔وہ اس وقت میرٹھ میں تھا لیکن اس کی اہم کتب اور انتخاب غزلیات بعد کو طبع ہوا جن پر ناقدین اور محققین نے مضامین لکھ کر اس کے ادبی کام اور اس کے نام کو بقادی۔اس کو عزیزؔ لکھنوی سے تلمذ کا فخر حاصل تھا۔اس کی غزل کا غالب عنصر تلاش حسن اور جمالیات ہے۔ اس نے اس تلاش میں اپنی نامراد زیست کو بھی پُر جمال بنایا۔لہو کی بوند کو یاقوت احمر کی چمک دی۔

اس پر الفاظ کی تراش وخراش مستزاد ہے ۔

نہ جانے زخم دل کی آج گہرائی کہاں پہنچی پھٹا جاتا ہے سینہ وہ خوشی محسوس ہوتی ہے

حجاب اک رمز محبوبی ہے حسن جلوہ ساماں میں جھلک کر رہ گئیں رنگینیاں گلہائے خنداں میں

کسی نے چہرے پہ بکھرا لیا تھا زلفوں کو ذرا سی بات تھی بس لے اڑے ہیں دیوانے

جلوۂ حسن نے اک آگ لگا دی دل میں آگ وہ آگ کہ جس نے چمن آرائی کی

یہ دل کا اضطراب اور حسن کی یہ جلوہ سامانی کہ جیسے جام بھر کر دے دیا ہو دست لرزاں میں

زندگی تلخ و تمنائے اجل تنگ حیات خون سینے میں نہ کیوں کر دلِ انسان ہو جائے

تیری رحمت سے نا امید نہیں اپنی محرومیوں سے ڈرتا ہوں

مفتی صابر حسن شیوا عثمانی اور شیام موہن لال جگر کے علاوہ بعض ایسے شعراء نے جوان دونوں کی رفعت کو تو نہیں پہنچے لیکن انہوں نے اپنی مساعی سے اس تعطل کو ختم کیا جو ۱۹۴۷ء کے بعد پیدا ہوا تھا، اپنے تلامذہ اور نجی نشستوں کے ذریعہ بریلی میں غزل کا احیاء کیا اور بزم سخن جما دی، علی حسین ضمیر (م ۱۹۶۸ء)، تبارک علی عبرت (م ۱۹۹۰ء)، ماتا پرشاد زیب (م ۱۹۷۸ء)، کشن لال ثاقب (م ۱۹۸۵ء) اور نرائن داس ٹنڈن دیا (م ۱۹۷۰ء) نہایت اہم اسماء ہیں۔ ضمیر اور زیب سیماب اکبرآبادی کے شاگرد تھے۔ عبرت صدیقی دل شاہ جہاں پوری کا۔ ثاقب اور دیا بلدیو پرشاد سوزن سے وابستہ تھے۔ یہ سب بزرگ شاعر تھے۔ سب ہی صاحب دیوان تھے۔ ان کے معیار غزل گوئی کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے کیا جا سکتا ہے ۔

کریں گے وعدہ ضرور ایفا وفائے وعدہ ہے ان کا شیوہ
یہ دیر یوں ہے کہ منتظر کو سلیقۂ انتظار آئے — علی حسین ضمیر

قصۂ غم کا نیا طرز بیاں ہوتا ہے
اشک جو آنکھ سے ڈھلتا ہے زباں ہوتا ہے — تبارک علی عبرت صدیقی

جس میں ترا خیال مرا ہم سفر نہیں
میں نے سمجھ لیا وہ تری رہ گذر نہیں — ماتا پرشاد زیب

کس کس کو رازِ خونِ تمنا بتائیں ہم

بہتر ہے حادثے کو اگر بھول جائیں ہم کشن لال ثاقبؔ

اپنے جلووں میں دیکھ لو مجھ کو

پردہ داری کی ایک صورت ہے نرائن داس ٹنڈن دیاؔ

تقسیم ہند کے وقت، اس سے دو چار سال پہلے یا دو ایک سال بعد کئی نوجوان شعراء بریلی کے سپہر شاعری پر نمودار ہوئے۔ ان کے سفر کا آغاز پُر آشوب فضا میں ہوا۔ وہ بریلی کے ہی کسی نہ کسی استاذ کے شاگرد تھے۔ انہوں نے ترک وطن نہیں کیا اور نا مساعد حالات کے باوجود آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کی طبیعت جدت اور اختراع پر مائل تھی۔ انہوں نے آگے چل کر غزل گوئی میں نام پیدا کیا۔ ان شعراء میں چار نام بہت اہم ہیں: انور بیگ انورؔ چغتائی تلمیذ عبرتؔ صدیقی، محمد مبین بدرؔ (م ۱۹۸۸ء) تلمیذ شفیق عشرتؔ شمسی، حامد حسین عزمیؔ تلمیذ شیوا عثمانی اور رفعت حسین کیفیؔ (م ۱۹۸۸ء) تلمیذ عبرتؔ صدیقی۔

انورؔ چغتائی کی غزل میں شدت احساس ہے۔ انسانی دکھ درد کی تفہیم ہے۔ اس کا محبوب بھی انسانی غم ونشاط کی علامت ہے۔ یہی اس کی انفرادیت ہے۔ از وست ؎

وہ اپنے حسن میں کسی درجہ خوشنما ہوگا

جو ہر فسانے کا عنوان بن گیا ہوگا

نہ گھٹا نہ سبزہ نہ پھول ہے نہ شراب ہے نہ نگار ہے

یہ چمن میں دورِ خزاں نہیں مرے عہدِ غم کی بہار ہے

وہ ہم پہ ظلم ڈھائیں تو کچھ بات ہی نہیں

ہم مسکرا بھی دیں تو شرارت کی بات ہے

محمد مبین بدرؔ نے اپنی شاعری کا آغاز روایتی غزل سے کیا لیکن کثرت مطالعہ کی وجہ سے اس کے قدم رفتہ رفتہ جدید اسلوب غزل کی طرف بڑھ گئے۔ اس کی غزل کا جدید رنگ اکتسابی تھا۔ ''خوابوں کا لہو' جو اس کی غزلیات کا مجموعہ ہے، اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس کی اشاعت سے جدید طرز کی غزلیات کا پہلا مجموعہ بریلی کے شاعر کا منظر عام پر آیا۔ بدرؔ کے اکلوتے نوجوان بیٹے کی موت کا غم اس کا تعاقب کرتا رہا۔ یہی غم ایک علامت بن گیا جو خوابوں کی رمزیہ

اشاریت کی طرح اس کے اشعار میں ظاہر ہوا۔مثلاً ؎

جو اب شجر پہ نہیں ہے اس ایک پتے کو
ہوائیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں پاگلوں کی طرح

قدم قدم پہ لڑا بدرؔ جو اندھیروں سے
وہ زخم زخم اُجالا تو میرا اپنا تھا

سوا نیزے پہ ہے سورج مرے جلتے مسائل کا
مری دنیا کسی نے عرصۂ محشر میں رکھ دی ہے

رفعت حسین کیفی نے ایک خوش گلو مغنیہ سے ملاقات اور جدائی کے واردات اپنی غزل میں پیش کیے۔ یہ ایسی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ نئی بات اس کی واقعاتی غزل کا باوقار طرز ادائیگی ہے جو کبھی کبھی کلاسیکیت کی حدوں کو چھونے لگتا ہے۔ ایسے باوقار اسلوب غزل میں بھی ندرت ہے جو اس نے الفاظ اور قوافی و ردیف سے پیدا کی۔ مثال میں مندرجہ ذیل اشعار پیش کیے جاتے ہیں ؎

تیرا ترنم حسنِ بیاں ہے میری غزل حسنِ الفاظ
اک ربطِ الفاظ و بیاں ہے تیرا ترنم میری غزل

انہیں لاکھ تم بناؤ یہ کھلے کھلے سے گیسو
میرے ہاتھ سے سنورتے تو کچھ اور بات ہوتی

اے خالقِ روز و شب اس گھر میں اندھیرا ہے
بے وقت بھی رہتی تھی جس گھر میں سحر پہلے

دل بھی اک قبلۂ صد رشکِ حرم ڈھونڈے ہے
اپنی راہوں میں ترا نقشِ قدم ڈھونڈے ہے

ان لغزشوں کو نام گُنہ دے دیا گیا
جن لغزشوں سے اہلِ حرم آشنا نہیں

شرمگیں شرمگیں نظر ان کی

کچھ تعلق طلب سی لگتی ہے

کیفی کی عاشقانہ غزلیات اس کے مطبوعہ مجموعۂ کلام مسمّٰی آزر کے صنم میں شامل ہیں۔
کیفی نے اس کرب کی ترجمانی نہیں کی جو تقسیم ملک کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اس نے مغنیہ سے رستگاری کے بعد اپنے اسلوب غزل کو بدلا۔ اس نے تمثیلات کا سہارا لیا اور ان تمثیلوں کے ذریعہ اپنے کرب اور تشخص کو پر جمال بنا کر پیش کیا۔ مثلاً ؎

جلتا کوئی چراغ یہ کب تھا مرا نصیب
آنگن میں روشنی تو پڑوسی کے گھر کی تھی

ہم ایک برف پہ لکھی ہوئی عبارت ہیں
ذرا سی دھوپ دکھا دو تو بس پگھل جائیں

حامد حسین عزمیؔ کی غزل بھی نقطۂ عشق کا پھیلاؤ ہے جو احساس مستقل اور یاد ماضی کی وجہ سے لامتناہی سطر بن چکا ہے۔ عزمیؔ نے بہت ہی سادہ زبان میں واردات گذشتہ کا اظہار کیا۔ اس کے اشعار غزل میں اس کے نشاط انگیز تصورات کی تجسیم ہوئی جن کو اس نے بڑے معصوم انداز میں پیش کیا۔ مثال میں مندرجۂ ذیل اشعار نقل کیے جاتے ہیں ؎

آؤ پھر باغ سے کچھ آم چرا کر لائیں
آج تھوڑی سی شرارت سہی بچپن کی طرح

ایک وہ بات کہ بے بات کا افسانہ ہے
تم سے کہنا ہے وہی بات قریب آجاؤ

ہر اک مکاں کے شعلوں میں ہے ایک سی تپش
وہ تیرا گھر نہیں تو پڑوسی کا گھر نہ ہو

روشنی دور دور جاتی ہے
جب چراغِ گناہ جلتا ہے

تلاش کرتا ہوں خود کو وجود میں اپنے
مزار تو ہے مگر صاحبِ مزار نہیں

اس وقت ایک عمر رسیدہ شاعر مقصود حسین فیروز نظامی (پیدائش ۱۹۱۴ء/وفات ۱۵/ستمبر، ۲۰۰۴ء) نے اپنی زندگی کے کڑوے اور کسیلے تجربات کو غزل کی جدید لفظیت اور لہجے میں پیش کیا۔ وہ شاگرد تو جوش ملیح آبادی کا ہے لیکن اس کی غزل میں بڑی کشش ہے، اس کی طویل زندگی کی طرح شخصی وعصری تفکر کی نمو اور نمود ہے۔ ہر چند اس کو شہرت ایک رباعی نگار کی حیثیت سے ملی لیکن اس کی غزل بھی دعوت مطالعہ دیتی ہے۔ اس کے چند اشعار غزل مندرجہ ذیل ہیں ؂

امداد تو کسی نے نہ کی وقت پر مگر
افسانے بن گئے مرے دستِ سوال کے

منزلِ عشق سے چپ چاپ گذریے کہ یہاں
معجزے عقل کی پہچان میں کم آتے ہیں

اٹھ اور اٹھ کے کتابوں کا شہد پی
اس شہد نے مجھے تو بڑی کج کلاہی دی

فیروز بار بار خطاؤں کے باوجود
اللہ تیری شان کہ ماں نے دعا ہی دی

تقسیم ملک کے وقت جو نعت گویان بریلی میں محتشم ہو چکے تھے، ان میں شیوا عثمانی اور مولوی مصطفیٰ رضا خاں نوری (م ۱۹۸۲ء) بہت برگزیدہ شاعر ہیں۔ ایسے نعت گویان جو تقسیم ملک کے وقت سخن گوئی کی ابتدائی منزل میں تھے اور بعد کو پہچانے گئے، ان میں دیبی پرشاد مست (م ۱۹۸۰ء) اور مولوی تحسین رضا خاں تحسین کا نام لیا جاسکتا ہے۔ محمد سعادت حسین شیدا وارثی (م ۱۹۶۹ء) کا بھی ایک مجموعۂ نعت شائع ہوا جو روایتی اسلوب سخن میں تھا۔ محمد مبین بدر (م ۱۹۸۸ء) نے ایک مجموعۂ نعت مرتب کیا جو طبع نہیں ہوا۔ اس زمانے میں مشاعروں کی جان اور عوام میں بے حد مقبول ایک اَن پڑھ نعت گو ابراہیم خاں راز المعروف بہ ''بالو شاہی'' (م ۱۹۷۳ء) تھا جس نے سلیس زبان میں رواں اور جوشیلی نعت کہی۔ مختصر یہ کہ نامساعد حالات میں بھی نعت گوئی کا سلسلہ جاری رہا۔ بطور نمونہ مذکورہ نعت گویان کے ذیل میں اشعار درج کیے جاتے ہیں ؂

اگر ان کا کرم کشتی کا کھیون ہار ہوجائے

یہاں بھی پار ہوجائے وہاں بھی پار ہوجائے — ابراہیم خاں رازؔ

اپنی جبیں کو عرشِ معلّٰی کریں گے ہم
جا کر درِ رسولؐ پہ سجدہ کریں گے ہم — سعادت حسین شیداؔ وارثی

آپ کے عشق کو جس نے اپنا لیا آپ کی آرزو میں جو کام آگیا
اس کو اک مستقل زندگی مل گئی اس کو لطف بقائے دوام آگیا — مفتی صابر حسن شیداؔ عثمانی

دور ہے مجھ سے مدینہ میں مدینے سے ہوں دور
اے بنائے زندگی یہ زندگی اچھی نہیں — محمد مبین بدرؔ شمسی

جس کو کہتے ہیں قیامت حشر جس کا نام ہے
درحقیقت تیرے دیوانوں کا جشنِ عام ہے — تحسین رضا خاں تحسینؔ

شاہ محمد تقی راز (م ۱۹۶۷ء) المعروف بہ عزیز میاں خلیفہ وسجادہ نشین خانقاہ نیازیہ بریلی کا مجموعۂ کلام مسمی راز نیاز ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے کی اشاعت سے بریلی میں صوفی شاعری کا سلسلہ قائم رہا۔راز کے دو اشعار مندرجہ ذیل ہیں ؎

ہر دل ہے ترے عشق میں لبریز محبت
اک اور بھی پیمانے سے پیمانہ بنادے

خیر گذری نظر پلٹ آئی
اس سے ملتی تو ذات ہوجاتی

فرقان احمد خاں عزمؔ نے ریختی کے کوچے میں قدم رکھا جس سے اس کے مزاج اور کردار کو نسبت نہیں ہے۔اب نہ ریختی کا ماحول ہے اور نہ اس کی ضرورت۔عزمؔ کی ریختی میں وہ زنانہ پن بھی نہیں ملتا جو ریختی کے لیے ضروری ہے۔

شیام موہن لال جگرؔ نے مثنوی پیام ساوتری شائع کرکے اردو کے سرمایۂ مثنویات میں ایک اعلیٰ پایہ کی مثنوی کا اضافہ کیا۔اس مثنوی کی کہانی قدیم سنسکرت ادب سے ماخوذ ہے اور اس میں ایک آدرش ہندوستانی عورت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔منظر نگاری، جذبات نگاری، پختہ دلنشیں اور بے حد نازک اسلوب بیان اس مثنوی کی خصوصیات ہیں۔چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں ؎

طفلی تھی شباب کے اثر میں ملتی تھی چاندنی سحر میں
آمد ہوئی کنوار پن کی اس طرح گلشن میں نسیم آئے جس طرح
دیکھا نہ لباس نے بھی عریاں پتلی میں نظر ہو جیسے پنہاں

(از سراپا ساوتری)

بریلی میں کوئی ایسا شاعر جس کی مقبولیت کا انحصار اس کے مراثی پر ہو، ہنوز نہیں ملتا۔ ایام عزاداری میں سلام سوز نوحہ اور مناقب ضرور پڑھے جاتے ہیں لیکن اس طور کی حیثیت رسمی اور روایتی ہے۔

رباعی نگاری کا سلسلہ فیرؔوز نظامی نے قائم رکھا اور رباعی نگار کی حیثیت سے اس کی بہت شہرت ہے۔ اس کی رباعیات اخلاقی اور حکیمانہ خیالات کے علاوہ عہد حاضر کی کج روی، ہنگامہ آرائی اور الجھنوں سے متاثر ہیں۔ اس کی رباعیات کا اسلوب بیان بھی جدید لب و لہجے میں ہے۔ بوجہ قادرالکلامی اس کی گرفت میں ہر موضوع ہے۔ اس کا رویہ کبھی ایک مصلح اور کبھی ایک طنز نگار ہے۔ کبھی شعلہ کبھی شبنم۔ اس کی رباعیات عصری آگہی کا آئینہ ہیں۔ اس کی دو رباعیات مندرجہ ذیل ہیں ؎

تخریب کو زندگی کے لالے پڑ جائیں چہرے ستم و جور کے کالے پڑ جائیں
ہم آج اگر جھوٹ سے توبہ کرلیں کل ساری عدالتوں میں تالے پڑ جائیں
لفظوں کی کھنک رخ کی دمک مار گئی آواز کا رس چھب کی دمک مار گئی
اس دل کو سمجھتے تھے اَمر ہم لیکن اک ریشمی لہجے کی لچک مار گئی

فیرؔوز نظامی نے نعتیہ رباعیات بھی کافی تعداد میں لکھی ہیں۔

قطعہ نگاری کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اس وقت ہر ایک شاعر مشاعرے میں غزل سنانے سے پہلے دو تین قطعات ضرور سناتا تھا۔ عتیق اللہ خاں امیدؔ (م ۱۹۶۷ء) نے دو مجموعے قطعات کے چھوڑے جن کے نام ہیں جل ترنگ اور فکر و نظر۔ یہ مجموعے غیر مطبوعہ ہیں۔

بیسویں صدی عیسوی کے پہلے ربع میں ہی بریلی میں نظم نگاری کا آغاز ہوا اور دوسرے ربع میں اس کو استحکام ملا۔ ۱۹۴۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنّفین بریلی میں قائم ہوئی۔ ۱۹۴۸ء میں

اس کا احیاء ہوا۔اس انجمن سے وابستہ شعراء جوان العمر تھے اور ان کے اعصاب پر مخدوم محی الدین، اسرار الحق مجاز اور سلام مچھلی شہری وغیرہ سوار تھے۔ اس انجمن نے نئے لہجے سے آگاہ کیا ورنہ مجموعی طور پر اس کا دائرہ رومانتک شاعری تک محدود تھا۔اس انجمن نے اشتراکی نظریے کا حامل کوئی قابل ذکر شاعر پیش نہیں کیا۔تین برس گذرنے کے بعد انجمن ختم ہوگئی۔ بریلی کے اہم شعراء قومی، سیاسی، اصلاحی اور رومانتک نظمیں لکھ رہے تھے۔ان کا طرز سخن جوشیلا اور خطیبانہ تھا۔ انہوں نے آزاد نظم کو منہ نہیں لگایا۔انہوں نے آزادی وطن کے بعد نظم نگاری کے موضوعات میں اضافہ کیا۔مختصر یہ کہ اس وقت نظم نگاری کی چہل پہل میں جو شعرائے بریلی معروف ہوئی، ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

عتیق اللہ خاں امید: اس نے نظموں کے چھ مجموعے چھوڑے جن کے نام ہیں سوز و اضطراب، تسنیم وکوثر، رنگ وآہنگ، رباب وشباب، بربط وطاؤس، موج وگرداب۔ان میں سے کوئی بھی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔اس کی نظمیات رومانتک ہیں۔اس کی نظموں میں احساس حسن کے ساتھ تخیل پرستی نہیں ہے۔قومی درد اور جوش ہے۔دبی دبی شکستہ آرزو کی کسک ہے۔

اوم پرکاش اوج: ادبیات انگریزی کا پروفیسر تھا۔اس نے سانٹ اور آزاد نظمیں تحریر کیں۔اس نے بھی اپنی منظومات شائع نہیں کرائیں۔

پرتاب چندر آزاد: تحریک آزادی میں شریک تھا۔سزائے قید بھی بھگتی۔اپنی نظموں میں قومی جذبات نظم کیے اور جیل کی ذہنی اذیت کو بیان کیا۔ ہندوستان کی تہذیبی اقدار بھی پیش نظر رہیں۔صاف ستھرے متوازن لہجے میں نظمیں لکھتا ہے۔اس کی نظموں کا مجموعہ مسمی انقلاب وطن دوبار شائع ہو چکا ہے۔

جگیشور ناتھ بےتاب: بنیادی طور پر رومانتک شاعر تھا۔عشقیہ، نیچرل اور قومی موضوعات کا انتخاب کیا۔ ہندوستان کی قدیم تہذیب میں بھی حسن تلاش کیا اور سنسکرت ادب پاروں کو اردو میں منتقل کیا۔حسن پرست اور تخیل طراز تھا۔اس نے منظومات اخبارات اور رسائل میں شائع کرائیں۔ایک طویل منظوم افسانہ تحریر کیا۔کالیداس کی شکنتلا کو اردو کا جامہ پہنایا۔اس کا مجموعۂ منظومات بعنوان ''شعلہ مضطر'' شائع ہو چکا ہے۔

کشن لال ثاقبؔ: بے حد زود گو تھا جس کا اثر اس کے کلام شعر پر پڑا۔ اس کی نظموں کا اسلوب قریب قریب بیانیہ ہے۔ رومانتک شاعری کے لیے تخیل طرازی ضروری ہے جو زود گوئی کی متحمل نہیں۔ اس نے مختلف مروجہ موضوعات پر نظمیں لکھ کر اخبارات اور رسائل میں شائع کرائیں۔ اس کی منظومات پر مشتمل کئی کتابیں مثلاً پیام وطن، لال و جواہر، گاندھی گاتھا اور زندگی کے موڑ شائع ہو چکی ہیں۔ غیر مطبوعہ کتب میں ٹیگور کے بنگلہ گیتوں کا ترجمہ۔ شریمد بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ، دروپدی کا ترجمہ، الیوداسیہ اپنشد کا ترجمہ اہم ہیں۔

نرائن داس ٹنڈن دیا: اس نے سانٹ اور آزاد نظمیں لکھیں جو اس کے مطبوعہ مجموعۂ کلام مسمّٰی شام بہاراں میں شامل ہیں۔ اس نے اپنی نظموں میں ہیئت کا تجربہ بھی کیا جو اس کی کبرسنی کو دیکھتے ہوئے مبارک ہی نہیں تعجب خیز قدم تھا۔

ماتا پرشاد زیب: اس کا حال ثاقبؔ سے مختلف نہیں تھا۔ بے حد زود گو تھا۔ روایتی طرز کی ہنگامی موضوعات پر کثیر تعداد میں نظمیں لکھ کر اخبارات و رسائل میں شائع کرائیں۔ اس نے عمر آخر میں ان نظموں کو یکجا کر کے شائع کرانے کا ارادہ کیا لیکن وہ پلندہ رائج الوقت سکوں سے خالی تھا۔ اس کی نظمیں ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔

لچھمی نرائن شائقؔ: کم گو مگر پختہ کار تھا۔ اس کی نظموں میں بہت زیادہ شعریت ہے۔ اس کی نظموں کا کتابی شکل میں طبع نہ ہونا ایک محرومی کی بات ہے۔

اوم پرکاش نزہت: حسن پرست، تخیل طراز اور تصوراتی پیکر بنانے میں ماہر۔ اس کی رومانتک نظمیں اعلیٰ پایہ کی ہیں جو اس کے مجموعۂ کلام ''خوابوں کے جزیرے'' میں شامل ہیں۔

محمد فاروق وحشت: اس نے کالیداس کے ڈرامے شکنتلا کے قصے کو نظم کیا جو سپاٹ اور شعریت سے عاری ہے۔

مذکورہ بالا نظم نگاروں کے علاوہ انورؔ چغتائی نے مختلف موضوعات اور مختلف مواقع پر نظمیں لکھیں اور ادبی و سماجی تقریبات میں سنائیں لیکن وہ ہمدست نہیں ہوئیں۔ انورؔ چغتائی کا مجموعہ کلام ''دو چار برس کی بات نہیں'' ۲۰۰۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ انورؔ چغتائی کی صلاحیت نظم گوئی سے انکار ممکن نہیں۔

محمد علی خاں ابلیسؔ اور تجمل حسین اخترؔ کی جگہ خالی رہی۔ ابلیسؔ جیسا ہجو نگار اور ہزل گو اخترؔ جیسا طنز نگار بریلی میں پیدا نہیں ہوا۔ ریاض الحسن شمسی نے نیم طنزیہ نیم مزاحیہ قطعات لکھ کر اور مشاعروں میں سنا کر قدرے قلیل پہچان بنائی لیکن اس کی اچانک موت نے اس کی پہچان کا خاتمہ کر دیا۔ تیج بہادر سنہا کیفؔ نے اپنے روہیل کھنڈ اخبار بریلی میں نیتاؤں اور الیکشن کی قلعی کھولی لیکن اس کے اشعار میں سطحیت ہے۔ مثلاً

نیتاؤں کی دنیا تو الیکشن پہ بسی ہے کرسی کی تمنا ہے کھلی دھوکہ دھڑی ہے
بھوکا کوئی مرتا ہے تو کیا کس کو پڑی ہے سب ملک کے نیتاؤں میں نفسی نفسی ہے
اب پنشنیں کھاتے ہیں سیاست کے کھلاڑی کیف اچھا ہے جس نے کوئی خدمت نہیں کی ہے

وہ شعراء جو ملک کے بٹوارے کے وقت غزل خوانی کر رہے تھے، ان میں سے بیشتر راہی ملک عدم ہو چکے۔ جو دو چار زندہ ہیں وہ نئی نسل کی تربیت شاعری کر رہے ہیں۔ نئی سماجیات کے ماحول میں بریلی کی بزم سخن سے قصیدہ، مثنوی، ہجو، ہزل، واسوخت، ریختی وغیرہ اٹھ چکے ہیں۔ تمام زور غزل گوئی پر ہے۔ طرز جدید کے مطابق نظم نگاری بھی نہیں ہو رہی ہے۔ گیت اور دوہے پر توجہ دی گئی ہے۔ امید یہی ہے کہ بریلی میں اردو شاعری کا ارتقائی سفر جاری رہے گا۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو اک نقشِ پا پایا (غالبؔ)

تاریخ محمدی: ایک تعارف

ڈاکٹر زرینہ خان

ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں ہندوستان میں دہلی سلطنت کی بنیاد مملوک خاندانوں نے ڈالی۔ مملوک سلاطین کا پہلا حکمران بادشاہ قطب الدین ایبک تھا جس نے ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء میں تخت دہلی پر جلوس کیا۔ قطب الدین ایبک کے بعد ناصر الدین قباچہ، شمس الدین التتمش اور اس کے بعد کئی حکمراں ہوئے جنھوں نے مختصر مدت کے لیے زمام حکومت سنبھالی، ان کے بعد بادشاہ ناصر الدین محمود نے تقریباً بیس سال حکومت کی اگرچہ وہ بہت کامیاب بادشاہ نہیں ثابت ہوا۔ اس کی وفات ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء میں ہوئی۔

ناصر الدین محمود کے بعد خلجیوں، تغلقوں اور لودھیوں نے فرماں روائی کی اور مسند دہلی کو رونق بخشی۔ طویل مدت تک ان خاندانوں کی حکومت نے ہندوستان کے صفحات علم وادب و تاریخ پر عمیق اثرات ثبت کیے۔ البتہ اس عہد کے بادشاہوں نے مسلسل تاریخ نویسی اور وقائع نگاری کی جانب توجہ نہیں دی۔ غالباً وقائع نگاری اور تاریخ نویسی کے شعبے کا قیام بھی نہیں ہوا۔ اس دور کے کچھ مولفین نے چند تاریخی کتابیں لکھیں جن میں محض رزم کی داستان سرائی پر زور قلم صرف کیا گیا جس کی وجہ سے اس دور کے ادبی، علمی، تمدنی حالات پر بہت کم روشنی پڑتی ہے۔ اگر کچھ حالات ان کتابوں میں ملتے بھی ہیں تو وہ بھی پراگندہ و منتشر ہیں۔

اس دور کے تاریخی حالات پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں قابل ذکر تاریخ فیروز شاہی، تاریخ فخر الدین مبارک شاہ، تاج المآثر اور طبقات ناصری ہیں۔ یہ تمام کتابیں دہلی سلطنت کے عروج کے زمانے میں تحریر ہوئیں۔ لیکن مملوک سلاطین، خلجیوں، تغلقوں اور لودھیوں کے زوال کے

ووُمنس کالج، شعبۂ فارسی، اے، ایم، یو، علی گڑھ۔

بعد اس دور کے متعلق زیادہ تاریخی حالات نہیں ملتے ہیں۔

پیش نظر تحریر میں نگارندۂ حاضر نے کتاب ”تاریخ محمدی“ کا ایک تعارف پیش کیا ہے جو نویں صدی ہجری کے نصف اول یعنی ۸۴۲ھ/۱۴۳۸ء میں تالیف ہوئی۔ یہ کتاب چار حصوں میں تقسیم ہے جسے مولف محمد بہامد خانی نے قسم کا نام دیا ہے، یہ عمومی تاریخ ہے جو نبی کریم ﷺ کے ذکر مبارک سے شروع ہوکر مولف کے عہد پر ختم ہوتی ہے۔ اس کتاب میں ۷۵۵ھ/۱۳۵۴ء سے ۸۴۲ھ/۱۴۳۸ء تک کے حالات قلم بند ہیں۔ خصوصاً قسم چہارم میں مولف بہامد خانی نے جو تاریخی واقعات نقل کیے ہیں وہ بایں وجہ معتبر اور مستند ہیں کہ خود مولف ان واقعات کا چشم دید گواہ ہے۔ اس اعتبار سے اس کی اہمیت دوچند ہوجاتی ہے۔ دہلی سلطنت کے زوال پذیر دور کے حالات اور مقامی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی تفصیل دلچسپ ہے۔ تاریخ محمدی کا تعارف پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولف کے احوال زندگی جو بقلم مولف کتاب میں نقل ہیں ان سے قارئین گرامی آگاہی حاصل کریں۔

مولف محمد بہامد خانی کے والد کا نام ملک الشرق ملک (۱) بہامد خان تھا۔ اس نے فیروز خان بن ملک تاج الدین ترک کے خانوادے میں پرورش پائی۔ فیروز خان کو غیاث الدین تغلق شاہ نے تخت سلطنت پر جلوس کے بعد اپنا وزیر مقرر کیا تھا۔ ۷۹۱ھ/۱۳۱۱ء میں غیاث الدین تغلق کے قتل کے بعد وزیر فیروز خان بن ملک تاج الدین ترک کے بیٹے نے ریاست کالپی پر قبضہ کیا اور اسے محمد آباد کا نام دیا۔ کالپی پرگنہ بیانہ میں آتی ہے۔ وہ آزاد حکمران بن گیا اور نصیر الدین محمد شاہ کا لقب اختیار کیا اور اپنے بھائی جنید خان کو وزیر مقرر کیا۔ بہامد خان نے نصیر الدین محمد شاہ کے ماتحت فوجی سردار کا عہدہ اختیار کیا اور کئی جنگی مہمات سر کیں اور فتح یاب ہوا۔ جس کے صلے میں اسے ایرچ اور بندیل کھنڈ کی جاگیر عطا ہوئی، لیکن وہاں سے اسے کچھ سال بعد ابراہیم شاہ جونپوری کی فوجوں نے بے دخل کردیا اور اس معرکہ میں ملک بہامد خان کی اہلیہ کا قتل ہوگیا اور خود مولف بہامد خانی بھی شدید زخمی ہوگیا۔ اس وقت وہ نوعمر تھا لیکن بعد میں وزیر جنید خان کے بیٹے مبارک خان کی مدد سے دوبارہ اپنی جاگیر حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ مبارک خان کتاب تاریخ محمدی کی تالیف کے وقت یعنی ۸۴۲ھ/۱۴۳۸ء میں زندہ تھا (۲)۔ مولف بہامد خانی کو اس کے والد نے کئی جنگی مہمات پر بھیجا، جن میں اس نے اپنی سوجھ بوجھ، بہادری اور بہترین کارکردگی کا ثبوت دیا۔

مولف بہامد خانی کی زندگی میں ایک ایسا موڑ آیا جب اس کی روحانی اور دنیاوی زندگی میں تغیر رونما ہوا۔اس کی ملاقات اس وقت کے مشہور صوفی بزرگ شیخ یوسف بدھ سے ہوئی اور وہ ان کا مرید ہوگیا۔اپنے پیر روحانی کی صحبت میں رہ کر مولف متقی اور پرہیز گار ہوگیا اور دنیاوی لوازم وخواہشات اور رنگینیوں سے دور ہوگیا۔اس زمانے میں مولف نے تاریخ محمدی کی تالیف کا آغاز کیا اور کتاب کی تکمیل ۸۴۲ھ/۱۴۳۹ء میں ہوئی۔(۳)

''کتاب تاریخ محمدی'': تاریخ محمدی ایک مقدمہ اور چار حصوں پر مشتمل ہے۔ہر حصے کو قسم کا نام دیا ہے۔مقدمہ کا آغاز حمد وثنا اور نعت محمدؐ سے ہوتا ہے۔مقدمہ میں منظوم قطعہ تاریخ مولف نے نقل کیا ہے:

نوشتم من ایں نغز تاریخ را بنام پیامبر علیہ السلام
محمد شہنشاہ پیغامبران کہ پیغامبری شد بد و اختتام
رسولی کہ از حکم انگشت او دونیمہ شدہ قرص ماہ تمام
رجاہست کا ندر جہان ایں کتاب مرا نام و بانگی بود بر دوام
خداوند از لطف وافر دہد مقر مولف بدار السلام (۴)

مقدمہ میں کتاب کے نام کے متعلق محمد بہامد خانی رقم طراز ہیں:

''امابعد چنیں گوید بندۂ درگاہ سبحانی،محمد بہامد خانی،عصمة الله عن الميل الى الفانی کہ چوں کتب تواریخ ماضیہ ونسخ اخبار ماتقدم بدیدۂ تفکر وچشم تدبر منظور وملحوظ گردانیدم و فوائد بسیار وعواید بیشمار حاصل آوردم بر سبیل ایجاز واختصار برطریق تطویل واشباع آنچہ خلاصۂ اخبار بود التقاط کردم۔وتاریخی مشحون بانواع قصص وحکایات وکتابی مملو باصناف اسماء وکیفیات پرداختم و دیباچہ آنرا باسم میمون و لقب ہمایوں سید المرسلین وخاتم النبیین ،جلیس سریر نبوت و صاحب مسند فتوت وسوار ساعد ملاحت وسوار مضمار فصاحت واختر برج مشتری وگوہر درج پیامبری،امام الانبیاء وتاج الاتقیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ،موشح ومزین ساختم ونام ایں کتاب راکہ القاب مستطاب شاہ نطع پیامبری وماہ سپہر سروری،زیب وزینت یافت''تاریخ محمدی''نہادم.............، ایں''تاریخ محمدی''برچہار قسم نہادہ آمدہ است''۔(۵)

قسم اول: ذکر سید المرسلینؐ، آپؐ کی اولاد و احفاد، صحابہ کرامؓ، کیفیت احوال قبر و منکر نکیر، مقام ارواح، احوال آخرت، ذکر قیامت، حشر، حساب و کتاب، طبقہ اسلام در بہشت و جنت و فرقہ کفار، درنار و آتش اور ذکر رویۃ ملک الملوک وغیرہ کا بیان ہے۔ (قسم اول و دوم اوراق ۱۷۴)

قسم دوم: قسم دوم میں خلفائے راشدین و عشرہ مبشرہ رضوان اللہ علیہم اجمعین، امرای بنی امیہ و خلفای بنی العباس، اولیاء کرام اتقیای عظام اور اپنے پیرومرشد، مربی وہادی ملک العلماء، تاج الفضلاء و علامۃ الدھر، صاحب النظم والنثر شیخ شیوخ زمان و قطب الاقطاب شیخ یوسف بدھ بن محمود کا تفصیل سے ذکر کیا ہے (۶)۔ احوال شیخ شیوخ کے ضمن میں جن دیگر صوفیہ کا ذکر ہے ان میں شیخ سنائی، سعدی، عطار، بختیار کاکی، بہاؤالدین زکریا ملتانی، فریدالدین گنج شکر، معین الدین سجزی، نظام الدین اولیاء، نصیرالدین محمود اودھی، سید جلال الدین بخاری کے احوال شامل ہیں، بہامد خانی نے صوفیہ اور بزرگان دین کے ذکر میں تمام معلومات تذکرۃ الاولیاء، مطالب الانوار اور خزانہ جلالی سے اخذ کیے ہیں جن کا ذکر خود مولف نے کیا ہے۔

قسم سوم (۷): ملوک دین و امرای اسلام کے متعلق ہے۔ اس حصے میں مولف نے ایران و افغانستان اور عراق کے سلاطین جیسے سلاطین طاہریان، سامانیان، دیلمیان، سلجوقیان، سبکتگیان، محمودیان، سجزیان، کردیان، خوارزم شاہیان، سیستانیان اور ترکستان کے شنبسانیان، غوریان، بامیانیان، چنگیز خان لعین فرمان دہ چین، امیر تمر (تیمور) اور اس کے جانشینان وغیرہ کا ذکر ہے۔ چنگیز خان کا نام جہاں بھی لکھا ہے اسے چنگیز خان لعین ہی لکھا ہے، تاج الدین یلدز کی وفات کے بعد کی تفصیل نہیں ہے۔ قسم سوم کا بیشتر مواد مولف نے من و عن طبقات ناصری سے نقل کیا ہے جس کا خود اس نے حوالہ دیا ہے۔

ہندوستان پر مغلوں کے حملے کا ذکر بھی مختصر طور پر کیا ہے۔

قسم چہارم (۸): ذکر سلاطین ہند اور ملوک سندھ ہے۔ سلاطین ہند میں سب سے پہلے سلطان قطب الدین ایبک المعزی کا ذکر اور آخری سلطان ناصر الدین محمود کا ہے۔ یہ مطالب طبقات ناصری سے لیے گئے ہیں۔ باقی آٹھ بادشاہوں کے حالات تاریخ فیروز شاہی سے اخذ کیے گئے ہیں جن میں غیاث الدین بلبن، معزالدین کیقباد، جلال الدین خلجی، علاؤالدین خلجی،

قطب الدین مبارک، غیاث الدین تغلق، محمد بن تغلق اور کمال الدین فیروز شاہ ہیں۔

کمال الدین فیروز شاہ کے تذکرے کے ذیل میں بہامد خانی لکھتا ہے کہ ضیاء الدین برنی نے کمال الدین فیروز شاہ کی سلطنت کے صرف چار برسوں کے حالات لکھے ہیں۔ بعد کے واقعات وکوائف مولف نے اپنے مستند ذرائع اور بعض معتبر اشخاص سے حاصل کیے۔ کمال الدین فیروز شاہ کے جانشین تغلق شاہ بن فتح خان بن فیروز شاہ، ابوبکر بن ظفر خان بن فیروز شاہ اور نصیر الدین محمد شاہ بن فیروز شاہ جو ۷۹۴ھ میں تخت نشین ہوا، ان سب کے احوال نقل کیے ہیں۔

نصیر الدین محمد شاہ کے عہد حکومت کے ذیل میں مولف نے چار علاقائی ریاستوں کا ذکر کیا ہے جو نصیر الدین محمد شاہ کے امیروں نے قائم کی تھیں۔ ان ریاستوں میں جونپور کے ابراہیم شاہ، گجرات کے احمد شاہ، دہلی کے حاکم خضر خان کے پوتے سلطان محمد اور مالوہ کے حاکم علاؤ الدین محمود شاہ کا ذکر ہے۔ ان حکمرانوں کے متعلق عموماً معلومات کمیاب ہیں۔ اس اعتبار سے کتاب کا یہ چوتھا حصہ نہایت اہم ہے۔ علاؤ الدین محمود شاہ کے بعد علاؤ الدین سکندر شاہ بن محمد شاہ، غیاث الدین محمود شاہ بن محمد شاہ فیروز شاہ کے خاندان کا آخری حکمران ہوا۔

نصیر الدین ترک نے ۷۹۲ھ میں غیاث الدین محمود کے بعد اپنی خودمختاری کا اعلان کیا اور ریاست کالپی جو پرگنہ بیانہ میں آتی ہے، خودمختار ریاست قائم کی اور اس کا نام "محمد آباد" رکھا۔ اپنی سلطنت کو وسعت دی اور اپنے ہمسایہ ہندو ریاستوں سے جنگیں کیں اور کامیابی حاصل کی۔ نصیر الدین ترک کی وفات ۸۱۳ھ میں ہوئی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اختیار الدین عبد المجاہد قادر شاہ تخت نشین ہوا۔ اس کی وفات ۸۳۵ھ میں ہوئی۔

اختیار الدین کی وفات کے بعد اس کے تین بیٹوں میں تخت نشینی کے لیے جنگ ہوئی۔ ان کے طاقتور ہمسایہ ابراہیم شاہ والی جونپور اور ہوشنگ شاہ والی مالوہ نے دوسرے بیٹے جلال خان کا ساتھ دیا جو ان کی مدد سے تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ جنید خان، وزیر ریاست کالپی کو جلال خان کی تخت نشینی سے اختلاف تھا اس نے ایرچ میں اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا اور ۸۳۹ھ میں آزاد حکمران بن بیٹھا۔ یہ تمام حالات خود مولف کے چشم دید ہیں۔ مندرجہ بالا تفصیلات کی وجہ سے تاریخ محمدی کا چوتھا حصہ اہم ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

خاتمہ کے ذیل میں مولف لکھتا ہے:

''تاریخ محمدی کہ طراز ساریتواریخ روزگار است، از آغاز بانجام اواز مبداء باختتام پیوست''۔(۹)

کتاب کے آخر میں اپنے والد ملک الشرق ملک بہامد خان کے سوانح اور خود مولف نے اپنی حالات زندگی قلم بند کیے ہیں۔

تاریخ محمدی کا طرز نگارش سادہ وسلیس اسلوب کا نمونہ نہیں ہے۔اس زمانے کے رواج کے مطابق عربی زبان کا کثرت سے استعمال ہے۔القابات طول طویل ہیں۔جیسا کہ خود مولف نے نقل کیا ہے کہ اس کتاب کی تالیف میں اس نے تاج المآثر، طبقات ناصری، تاریخ فیروز شاہی اور تاریخ فخرالدین مبارک شاہ سے مطالب نقل کیے ہیں۔اسلوب نگارش کتاب تاج المآثر کی یاد دلاتا ہے۔البتہ عبارت زیادہ ثقیل اور مرصع نہیں ہے۔

کتاب ''تاریخ محمدی'' کا واحد قلمی نسخہ برٹش میوزیم کی فہرست، جلد اول میں موجود ہے۔ نمبر ۱۳۷، اوراق ۴۸۲، سائز "x7" $10\frac{3}{4}$، سطر ۱۷، خط نستعلیق، سترہویں صدی کا مکتوبہ ہے، کاتب حافظ بن شریف منصور ہیں۔

برٹش میوزیم کے قلمی نسخے کا عکس شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں موجود ہے۔ سمینار لائبریری میں Photograph۔۶۳ نمبر سے کیٹلاگ میں موجود ہے۔میں نے اسی نسخے سے استفادہ کیا ہے۔اس قلمی نسخے کے شروع کے چند اوراق پر مولف کا نام محمد بہادر خانی درج ہے لیکن بعد میں محمد بہامد خانی ہی نقل ہے اور یہی صحیح ہے۔

مولف محمد بہامد خانی کا ذکر تذکرہ علمای ہند، طبقات ناصری، منتخب التواریخ، تاریخ فرشتہ، اخبار الاخیار، تذکرہ روز روشن، تذکرہ عرفات العاشقین، تذکرہ آتش کدہ، لباب الالباب، تاریخ فیروز شاہی اور تاریخ فخر الدین مبارک شاہ، خزانہ جلالی وغیرہ میں ملتا ہے۔

حواشی

(۱) احوال ملک الشرق ملک بہامد خان، ص ۴۶۷۔ (۲) ایضاً۔ (۳) احوال مولف، ص ۴۷۸۔ (۴) مقدمہ، تاریخ محمدی، ص ۸۔ (۵) ایضاً، ۷-۳۔ (۶) شیخ یوسف بدھ کی وفات ۸۳۴ھ میں ہوئی، تاریخ محمدی، ص ۱۶۴۔ (۷) قسم سوم، اوراق ۳۰۳-۱۷۵۔ (۸) قسم چہارم، اوراق ۴۸۲-۳۰۴۔ (۹) خاتمہ، ص ۴۸۲-۴۷۸۔

مآخذ

۱-فہرست برٹش میوزیم، جلد اول، چاپ لندن (انگریزی)۔۲-potograph-63، شعبۂ تاریخ، اے، ایم، یو، علی گڑھ۔

جدید معاشی مسائل کا ایک تجزیہ

ڈاکٹر محمد خالد

جدید زمانے کے بہت سارے سیاسی، سماجی اور اخلاقی مسائل میں معاشیات کا مسئلہ سرفہرست ہے، تلاش معاش، روزگار اور حصول دولت کے مسائل کو جتنا حل کرنے کی کوشش ہورہی ہے حالات اتنے ہی الجھتے جارہے ہیں اور سردست پوری دنیا میں مسئلہ معاش دوسرے تمام مسائل کی بنیاد بنتا جارہا ہے۔

دور جدید کا انسانی معاشرہ جن بنیادی مسائل سے نبرد آزما ہے ان میں پیداواری وسائل پر چند مٹھی بھر افراد کا ناجائز اور غاصبانہ تصرف اور آمدنی و دولت کا چند ہاتھوں اور ملکوں میں مرتکز ہوجانا سرفہرست ہے، جس کی وجہ سے معاشی ناہمواری اور عالمی پیمانے پر غربت وافلاس میں روز افزوں اضافہ کے ساتھ ساتھ معاشرے میں اخلاق واقدار کا فقدان بھی بد سے بدتر ہے۔ دنیا میں امیر وغریب کے درمیان کا فرق بھی پہلے سے کہیں زیادہ ہے لیکن جدید ماہرین معاشیات اس ناہمواری کو ختم کرنے کے بجائے اس کو بڑھاتے رہنے پر کوشاں ہیں اور دلیل بھی دیتے ہیں کہ معاشی ترقی کے لیے سرمائے کا اکٹھا ہونا ضروری ہے اور افزائش اور ارتکاز سرمایہ کے لیے معاشی نابرابری کا ہونا بھی ازبس ضروری ہے اور یہی سرمایہ ترقی اور آمدنی میں اضافے کی بنیاد ہے جس کے بغیر معاشی ترقی اور پیداواری عمل کو آگے بڑھانا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے ہر تاجر اور سرمایہ دار اپنی دولت کو بڑھا کر اسے سرمائے کی شکل میں رکھنا چاہتا ہے اور پھر دوسرے مرحلے میں کل پیداوار کا ایک بڑا حصہ سرمائے کی قیمت کے طور پر (جسے عرف عام میں سود کہا جاتا ہے) اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔ نتیجتاً دنیا میں دولت صرف سرمایہ داروں کے پاس اکٹھی ہوتی جارہی ہے اور اسی وجہ سے

شعبۂ معاشیات، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ۔

امیر و غریب کا درمیانی فرق بھی مسلسل بڑھتا جا رہا ہے (۱) اور ایک ایسا عالمی معاشرہ وجود میں آتا جا رہا ہے جس میں دولت صرف ان لوگوں کے پاس مرتکز ہوتی جاتی ہے جن کی پیداواری وسائل (جس میں سرمایہ سرفہرست ہے) پر اجارہ داری ہے اور وہ ان وسائل کی من مانی قیمت وصول رہے ہیں۔

دور جدید کا معاشی نظام: اس وقت ترقی یافتہ مغربی ممالک نے ایک ایسا معاشی نظام دنیا بھر میں رائج کر رکھا ہے، جس میں پیداوار اور ان کے عوامل کا حصول سرمائے کے بغیر ممکن نہیں (۲) اور سرمائے کا حصول سود کے بغیر ممکن نہیں۔ اس عمل کے ذریعے سودی نظام روز بروز ترقی کرتا جا رہا ہے اور پیداواری عمل کا سارا دارو مدار سرمایہ دار پر ہے جبکہ مزدور، زمین اور دوسرے وسائل جو حقیقی پیداوار کے عوامل ہیں ان کی حیثیت ضمنی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ سرمایہ دار جس کا حقیقی پیداواری عمل سے برائے نام یا کم تعلق ہوتا ہے وہ کل آمدنی سے زیادہ بڑا حصہ سود کی شکل میں وصول کر لیتا ہے اور دوسرے حقیقی عوامل کی پیداواری عمل میں ان کی خدمت اور تعاون کے بھی بقدر ہی حصہ نہیں مل پاتا۔ یہی چیز قیمتوں میں بے تحاشا اور غیر حقیقی اضافے کا بھی سبب بنتی ہے اور سرمایہ دار اور دوسرے پیداواری عوامل کے درمیان آمدنی کی غیر منصفانہ تقسیم بھی اس کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا معاشی نظام ہے جس میں روپیہ غریب عوام کی جیب سے زبردستی نکال لیا جاتا ہے اور سرمایہ دار اور تاجر کی تجوری بھرتی رہتی ہے۔ اسی کے ذریعے کمزور اور غریب ممالک سے بھی دولت چھین کر امیر ممالک میں اکٹھی ہوتی جا رہی ہے، اس نظام میں عوام کی خواہشات اور ضروریات زندگی کو اتنا بڑھا دیا گیا اور اشیائے صرف کو اتنا پرکشش اور اہم بنا دیا گیا ہے کہ ہر انسان کا بنیادی مقصد صرف دولت کمانا اور اسے اشیائے صرف پر خرچ کرنا رہ گیا ہے۔ امیر اور غریب ہر ایک اس جال میں پھنستا جا رہا ہے اور اس پورے نظام کو سودی عمل کے ذریعے کنٹرول کیا جا رہا ہے۔ سودی نظام کے ذریعے ہی دولت سے دولت کمائی جا رہی ہے اور اسی کے ذریعے پوری دنیا میں پیداواری عمل اور طلب اور رسد کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ گویا سود ہی اس وقت سارے معاشی عمل کی کنجی ہے۔ اسی سود کی وجہ سے عالمی معاشی نظام اتنا غیر مستحکم ہو گیا ہے کہ صرف ایک دن یا ایک گھنٹہ میں اربوں کھربوں کی دولت ادھر سے ادھر ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے عدم استحکام اور دولت و آمدنی کی غیر منصفانہ تقسیم عمل میں آتی ہے۔ اسی لیے معیشت کو مستحکم کرنے اور دولت و آمدنی کی منصفانہ تقسیم کے لیے سودی نظام

سے چھٹکارا پانا بے حد ضروری ہے۔

معاشی مسائل کی بنیاد سود: دور جدید کے تمام معاشی مسائل خواہ وہ افزائش دولت سے متعلق ہوں یا تقسیم دولت سے، اس کی بنیاد سودی نظام معیشت ہے۔ معیشت کے اندر عدم استحکام، دولت کا غیر ضروری اور ناجائز ارتکاز، چھوٹوں پر بڑوں کی اجارہ داری، ضرورت سے زیادہ شرح منافع اور کم ذرائع اور کم سرمایہ لگانے والوں کا بازار میں عدم استحکام، اس طرح کے تمام مسائل کی بنیاد صرف سود ہے۔ اس وقت ماہرین معاشیات کو دو بڑے مسائل سے نبرد آزما ہونا پڑ رہا ہے جس میں پہلا معیشت سے عدم استحکام کو کنٹرول کرنا، اس کے بنیادی عوامل کو مستحکم بنانا تاکہ مستقبل میں پیداوار وصرف نیز طلب و رسد کے فیصلے آسانی سے لیے جاسکیں اور دوسرا آمدنی اور پیداوار کی عادلانہ تقسیم تاکہ ہر عامل کو اس کی محنت کے بقدر حصہ مل جائے۔ لیکن یہ دونوں بنیادی مسائل اس وقت تک حل نہیں ہوسکتے جب تک پیداوار اور سرمایہ کاری سے متعلق فیصلے سودی نظام کے تحت لیے جاتے رہیں گے۔ آج کے ماہرین بھی اس بات پر متفق ہیں کہ سب سے زیادہ مستحکم معیشت وہ ہوتی ہے جہاں شرح سود صفر ہو اور پیداواری عوامل کو پیداوار کے عمل میں ان کی شراکت اور صلاحیت کے اعتبار سے حصہ ملے اور کسی بھی عامل کو اس کے حصہ سے زیادہ یا کم نہ ملے۔ موجودہ سودی نظام میں پیداوار کی عوامل کے درمیان تقسیم کرتے وقت کل آمدنی کا ایک بڑا حصہ سود کی شکل میں سرمایہ دار کو چلا جاتا ہے (۳) جس کا حقیقی پیداوار کے عمل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ جدید ماہرین مرض کی وجہ کو جانتے ہوئے بھی اس کا علاج غیر متعلق دواؤں سے کرتے ہیں اور نتیجتاً مرض جوں کا توں نہ صرف برقرار ہے بلکہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔

سودی نظام میں بینکوں کو معیشت کی ریڑھ کی ہڈی مانا جاتا ہے۔ ہر ملک میں کرنسی اور زر کی طلب و رسد پوری طرح بینکوں کے ذریعے ہی ریگولیٹ کی جاتی ہے۔ ایک طرف یہ بینک کمپنیوں اور تجارتی اداروں کو اونچی شرح سود پر قرض دیتے ہیں، دوسری طرف عوام کو بھی غیر ضروری اشیائے صرف نیز دوسری ضروریات کے لیے وافر مقدار میں قرض دینے کے لیے تیار رہتے ہیں بلکہ قرض لینے کے لیے مختلف اسکیموں کے ذریعے حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں۔ اس طرح معیشت میں غیر ضروری طور پر زر کی رسد کو بڑھاتے ہیں جو مستقل طور پر افراط زر کا ذریعہ بن کر معیشت میں مہنگائی اور عدم

استحکام پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔

سودی بینک کاری اور بے حد وحساب منافع خوری کو صنعت وتجارت میں حوصلہ مندی کی بنیاد مانا گیا ہے۔ یعنی ہر معاشی فیصلہ صرف منافع کی بنیاد پر لیا جاتا ہے۔ خواہ اس فیصلے کا اثر معاشرے پر منفی ہو یا مثبت۔ آج دنیا کی آزاد کہی جانے والی معیشت وتجارت پورے منصوبہ بند طریقے سے سود اور منافع کے گرد گھوم رہی ہے۔ بینک پوری دنیا میں زر کی غیر ضروری رسد پیدا کر کے سوسائٹی کے ہر طبقے کو زیادہ سے زیادہ قرض لینے کے لیے اکساتے ہیں اور نتیجے کے طور پر حکومت، حکومتی ادارے، کمپنیاں اور افراد سب کے سب ان سودی قرضوں کے جال میں پھنستے چلے جاتے ہیں۔ موجودہ معاشی بحران کی بنیاد صرف سودی قرضوں کا غیر ضروری پھیلاؤ ہے۔ (۴) آسان سے آسان شرائط پر عوام وخواص کی وافر مقدار میں غیر ضروری قرضوں کے جال میں پھنسا کر انہیں بینکنگ اور سودی نظام کا دست نگر بنا دیا گیا ہے۔

دیکھا جائے تو سودی نظام کی بنیاد بہت پرانی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سودی لین دین کی شروعات ایک معاشرتی زندگی کے وجود میں آنے کے بعد ہی شروع ہوگئی تھی لیکن اجتماعی طور پر سودی کاروبار کا چلن اور ہر طرح کی تجارت، زراعت، صنعت وحرفت کی ترقی کے لیے بنیادی طور پر سودی سرمائے کی ضرورت اٹھارہویں صدی عیسوی میں یورپ میں صنعتی انقلاب آنے کے بعد ہوئی۔ اس صنعتی انقلاب کے آتے ہی بڑے پیمانے پر کل کارخانے وجود میں آئے، ان کے ذریعے پیداواری عمل میں تیزی، نیز بڑی مقدار میں پیداوار کے لیے سرمائے کی ضرورت نے سودی نظام کو عوامی پیمانے پر ترقی دی۔ زیادہ سے زیادہ منافع کمانے اور ذرائع پیداوار پر موثر کنٹرول حاصل کرنے کی ہوس نے طرح طرح کے سودی قرضے مختلف ناموں اور اسکیموں کے تحت عوام میں متعارف کرائے اور عوام وخواص کے لیے ان قرضوں کی ضرورت بھی پیدا کی گئی۔ اسی کے ساتھ بینکنگ ادارے وجود میں آئے۔ عوام کو اپنی پس انداز کی ہوئی رقوم ان بینکوں میں جمع کرنے کا لالچ دیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے کچھ مٹھی بھر لوگوں اور ملکوں نے دنیا بھر کے پیداواری عوامل وذرائع کو اپنے قبضے میں لے کر من مانے طریقے سے پیداوار کو بڑھانا اور من مانی قیمتوں پر اسے بیچ کر کثیر منافع کمانا شروع کر دیا۔ اس عمل نے دنیا بھر کی دولت کو چند مخصوص صنعت کاروں اور ان کے ملکوں میں جمع کرنا

شروع کر دیا اور دیکھتے دیکھتے دنیا ترقی یافتہ (دولت مند) اور ترقی پذیر (غریب اور پس ماندہ) قوموں میں بٹ گئی۔ وہ ممالک ترقی یافتہ قرار پائے جنھوں نے دنیا بھر کے پیداواری ذرائع اور عوامل کو اپنے مخصوص ہتھکنڈوں سے اپنے پاس جمع کرلیا اور دولت اور ذرائع آمدنی کے بڑے حصے پر قابض ہوگئے ۔ جو ممالک دولت و پیداواری ذرائع وعوامل کو اپنے قبضے میں نہیں رکھ پائے وہ ترقی پذیر کہلائے اور غربت، بے روزگاری، سرمائے کی کمی نیز ترقی یافتہ ممالک اور ان کے زیر اختیار عالمی بینک اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے لیے گئے سودی قرضوں کے جال میں بری طرح گرفتار ہوگئے۔(۵)

جیمس بیرو (James P.Bairoh 1995) نے اپنی ایک تحقیق میں ۱۹۶۰ کی ڈالر قیمتوں پر ۱۷۵۰ء اور ۱۹۹۰ء کے درمیان ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ممالک کی فی کس آمدنی کا موازنہ کیا ہے اور ان کے مطابق ۱۷۵۰ء میں موجودہ ترقی یافتہ ممالک کی فی کس اوسط آمدنی ۱۸۲ ڈالر ہوا کرتی جو بڑھ کر ۱۹۹۰ء میں ۳۴۹۰ ڈالر ہوگئی۔ جبکہ موجودہ ترقی پذیر ممالک کی فی کس اوسط آمدنی جو ۱۷۵۰ء میں ۱۸۸ ڈالر ہوتی تھی وہ اس مدت میں بڑھ کر صرف ۴۳۰ ڈالر ہوئی (۶)۔ یہ وہی زمانہ ہے جس میں سرمایہ دارانہ نظام کی روز افزوں ترقی ہوئی اور نتیجے کے طور پر دولت صرف چند ممالک کے پاس مرتکز ہوگئی اور دنیا کے زیادہ تر ممالک غریب ہوگئے۔ یوروپی ممالک کا استحصالی سامراجی نظام، جس نے ان دوسو سالوں میں ترقی پذیر ممالک کے وسائل و ذرائع پر قبضہ کر رکھا تھا، ان کی اس حالت زار کا ذمہ دار ہے۔ موجودہ دور میں بھی امیر وغریب کا درمیانی فرق اجتماعی اور انفرادی دونوں سطح پر لگاتار بڑھتا جارہا ہے۔ آج بھی دنیا کے امیر ممالک کی فی کس اوسط آمدنی چالیس ہزار ڈالر سے اوپر ہے جبکہ غریب ممالک میں فی کس آمدنی پانچ سو ڈالر سے بھی کم ہے۔ آج سے دوسو سال پہلے اس طرح کا فرق بالکل نہیں تھا اور یہ صرف اور صرف سرمایہ دارانہ معیشت اور سودی بینکنگ نظام کے فروغ کی وجہ سے ہوا ہے۔

درحقیقت اس نظام میں سرمایہ اور دولت صرف ان افراد کے لیے ہے جو سود دینے اور اصل مال واپس کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ گویا دولت مند افراد ہی مزید دولت مند بن سکتے ہیں، نتیجتاً پوری دنیا کے ذرائع پیداوار پر امیروں، دولت مندوں اور سرمایہ داروں کا قبضہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

آج جس طرح ترقی یافتہ ممالک غریب اور ترقی پذیر ملکوں کو ترقی، استحکام اور مساوات کے جھوٹے سبز باغ دکھا کر لوٹ رہے ہیں وہ اظہر من الشّمس ہے۔ دنیا کی اسّی فیصد آبادی غریب اور

ترقی پذیر ملکوں میں بستی ہے لیکن دنیا کی کل پیداوار میں ان ملکوں کا حصہ بیس فیصد سے بھی کم ہے۔ اس کے علاوہ دور جدید میں عالم گیریت اور نجکاری کے پرفریب نعروں سے جس طرح غریب ممالک کے ذرائع اور وسائل پر کثیر قومی کمپنیوں کا قبضہ ہوا ہے اس سے ان ملکوں کے عوام کی غربت و بے روزگاری اور بڑھی ہے اور دوسری طرف دولت و وسائل پر چند افراد کا کنٹرول مضبوط تر ہوا ہے۔

لطف یہ کہ یہ لوٹ یا مظلوم نوازی، حقوق شناسی، فرائض کی بجا آوری اور معاشی عدل و انصاف کے فروغ کے نام پر برپا ہے۔ایک فلاحی ریاست کے قیام کے لیے پیداوار اور وسائل کی عادلانہ تقسیم نہایت ضروری ہے لیکن موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت جس طرح کے معاشی عوامل میں ترقی پذیر ملکوں کے غریب عوام کو کاربند کیا جارہا ہے اس سے سوائے غربت اور مسائل کے بڑھنے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔

۲۰۰۸ء میں امریکہ میں مالیاتی بحران آیا اور ایک کے بعد ایک کئی کاروباری کمپنیاں اور بینک دیوالیہ ہوگئے۔ امریکہ کے اس بحران کا اثر پوری دنیا پر پڑا اور یورپ اور ایشیا کی تجارتی منڈیوں اور حصص بازار کے اشاریے پچاس فیصد تک گر گئے جس سے ابھی تک ان ممالک کو نجات نہیں مل سکی ہے۔اس بحران کی بنیادی وجہ بینکوں کی طرف سے گھریلو صارفین کو دیا جانے والا غیرضروری قرض اور عوام اور اداروں کے اندر اس سودی قرض کے واپس کرنے کی صلاحیت کا کم ہوجانا ہے۔سودی نظام کی یہ خاصیت ہے کہ جیسے ہی عوام یا اداروں کے اندر قرض یا سود واپس کرنے کی صلاحیت گھٹتی ہے یا ان کی آمدنی میں گراوٹ آنی شروع ہوتی ہے اس کا اثر پورے نظام پر پڑتا ہے اور اس میں لڑکھراہٹ شروع ہوجاتی ہے۔لیکن افسوس کہ سود جو کہ اس نظام کی خرابی کی جڑ ہے اسی کو نظام کا علاج تصور کیا جاتا ہے، نتیجتاً مرض ہے کہ لگاتار بڑھتا جارہا ہے۔(۷)

اسلام کا معاشی نظام: ان مسائل کے حل کا واحد راستہ ایک ایسے معاشی نظام کا فروغ ہے جس میں سرمایہ، اثاثہ اور معاشی عوامل، سود کے بجائے شراکت اور حصہ داری کی بنیاد پر متحرک کیے جائیں اور اسی پر اجرت کا تعین کیا جائے۔اس طرح کسی بھی عامل کو اجرت بغیر پیداواری عمل میں شرکت کے نہیں مل سکے گی اور منافع کا تعین بھی خدمت اور عمل میں حصہ داری کی بنیاد پر کیا جائے گا۔

اسلام میں سود کی اتنی شدید حرمت اسی لیے آئی ہے کہ اس میں سرمایہ اور اثاثے کی اجرت

معاشی عوامل اور خدمات میں بغیر راست حصہ داری کے ادا کی جاتی ہے اور اجرت ان کو ملتی ہے، جن کا پیداواری عمل سے برائے نام یا بالکل تعلق نہیں ہوتا۔ اسی بنیاد پر بعض جدید ماہرین بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ پیداوار کی منصفانہ تقسیم کے لیے نہایت ضروری ہے کہ ہر عامل کو پیداواری عمل میں راست حصہ داری بقدر آمدنی ملنی چاہیے اور یہی آمدنی کی عادلانہ اور منصفانہ تقسیم کی بنیاد بھی ہے۔

اسلام کا معاشی نظام جن دو بنیادی باتوں سے عبارت ہے، ان میں سے ایک ہے سود کا انکار اور دوسرا ہے اجتماعی اور انفرادی عدل اور معاشرتی فلاح اور یہی دونوں جدید معاشی نظام کی بھی بنیاد ہیں۔ بس فرق صرف یہ ہے کہ جدید نظام میں ہر معاشی عمل کو سود سے مربوط کر کے معاشی حرکات کی کنجی سود کو قرار دے دیا گیا ہے جبکہ اسلام کا نظام معیشت سود کو حرام اور باطل قرار دے کر معاشی حرکات اور عوامل کو حصہ داری کی بنیاد پر کنٹرول کرتا ہے اور معاشرتی فلاح اور اجتماعی عدل کو فکر آخرت سے جوڑ کر دولت و آمدنی کی عادلانہ اور منصفانہ تقسیم کو قابل عمل اور قابل حصول بنا دیتا ہے۔

اسلامی نظام معیشت کے مندرجہ ذیل پہلو قابل غور ہیں: (۸)

تلاش معاش کی انفرادی آزادی کے ساتھ ضروری ہدایات اور ترغیبات۔

حصول دولت کی آزادی کے ساتھ آمدنی وخرچ کے لیے ضروری ہدایات۔

زکوۃ، صدقات اور انفاق پر مبنی تقسیم دولت و آمدنی کا نظام۔

دولت کے ارتکاز (Accumulation of wealth) کو روکنے کے لیے قانونی حد بندیاں۔

غرباء ومساکین کی کفالت اور ان کے تئیں دولت مندوں کی اخلاقی ذمہ داریاں۔

ایک اسلامی نظام کے اندر صنعت وحرفت وتجارت میں ہر شخص آزاد ہے بشرطیکہ وہ ان اخلاقی حدود و قیود کی پابندی کرے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔ جدید نظام معاشیات میں اخلاق واقدار کی کوئی اہمیت نہیں اور ہر فیصلہ صرف منافع کی بنیاد پر ہوتا ہے، جس کی حدود کا تعین آجر اور سرمایہ دار کرتے ہیں، لیکن اسلام میں اس کی قطعی اجازت نہیں ہے کہ معاشی مسائل اور وسائل سے متعلق ہر فیصلہ صرف منافع کی بنیاد پر کیا جائے، جدید ماہرین معاشیات خواہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کے حامی ہوں یا اشتراکیت پر کاربند، ہر ایک معاشی فیصلوں کو انفرادی منافع اور افادیت یا پھر جابرانہ اجارہ داری کے ذریعے ایک غیر فطری اور غیر اخلاقی راستے

پر چلانے کا حامی ہے اور نتیجتاً معاشی مسائل کو حل کرنے میں یکسر ناکام ہے۔ یہ دونوں نظام ہائے معیشت معاشرے کو ایک معتدل اور مبنی بر انصاف نظام دینے میں یکسر ناکام رہے اور پیداوار اور تقسیم دولت کے دو انتہائی غیر عادلانہ اور معاشی ناہمواری کے نظام پر منتج ہوئے۔ ان دو نظاموں سے اشتراکیت کا نظام تو اپنی موت آپ مر چکا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام اپنی موت کا منتظر ہے۔

آج کے زمانے میں افزائش سرمایہ (capital formation) اور ارتکاز سرمایہ (capital accumulation) کو معاشی ترقی کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جب تک ایک عامل سرمایہ اکٹھا نہیں کر لیتا وہ پیداواری عمل کو آگے نہیں بڑھا سکتا۔ اس کے لیے سود کا سہارا لیا گیا۔ اس طرح ہر آجر اور صارف اپنی زائد از ضرورت آمدنی کو اثاثے میں بدلنے اور اس سے مزید آمدنی پیدا کرنے کے لیے بینکوں اور سرمایہ داروں کے پاس رکھنے لگا۔ یہی چیز معاشرے میں سودی کاروبار کی بنیاد بنتی ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کا نظریہ نہایت صاف اور واضح ہے۔ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ دولت انسان کے پاس امانت ہے اور اس دولت میں دوسروں کا حق ہے جو مشیت الٰہی کی حکمت اور مصلحت کے تحت اس کے پاس پہنچ گیا ہے۔ ہر مسلمان کو شریعت کی رو سے اس کا پابند بنایا گیا ہے کہ جو زائد از ضرورت دولت اس کے پاس آ گئی ہے اسے اصل حقداروں تک پہنچا دے

وَ فِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (الذاریات ۱۹:۵۱) ان کے مالوں میں سائلوں اور ناداروں کا حق ہے۔

اس لیے ہر ایک کی یہ ذمہ داری ہے کہ مال اکٹھا ہوتے ہی وہ اس کے حقداروں تک پہنچانے کے لیے فکر مند ہو جائے (۹)۔ اسلام نے مال و دولت جمع کرنے کے بجائے اسے زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے پر زور دیا اس سے دولت اور سرمائے کا ارتکاز نہیں ہوتا اور معیشت کے اندر پیداوار اور پیداواری عوامل مستقل گردش کرتے رہتے ہیں، جس سے پیداوار آمدنی، روزگار اور معاشی ترقی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے نیز غربت اور امارت کے بیچ کا فرق بھی گھٹتا رہتا ہے۔ اسلام میں مال کو اللہ کا فضل بتایا گیا ہے۔ اسلام دولت کمانے کا حکم بھی دیتا ہے اور اسی کے ساتھ خرچ کرتے رہنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے ''محسنین'' کا درجہ دیا ہے (قرآن ۳:۱۳۴)۔ اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کو پوری نوع انسانی کی

ضروریات کو پورا کرنے کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ ساری انسانیت کا مشترک ذخیرہ ہے اور کسی بھی آدمی کو اس بات کی قطعی اجازت نہیں ہے وہ اللہ کے اس فضل کو صرف اپنے پاس ذخیرہ کر لے اور دوسرے حقداروں کو ان کے حق سے محروم کرے۔ ہر حقدار کو اس کا حق ہے کہ وہ اس دولت میں سے اپنا حصہ پائے۔ اسلامی نظام معیشت کے اندر زکوٰۃ، صدقات، خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے اس بات کو قابل عمل بنا دیا گیا ہے اور سرمایہ اور دولت کے ارتکاز (accumulation) کی حوصلہ افزائی کرنے والے عوامل کو ضروری احکامات کے ذریعے روک دیا گیا ہے۔

نظام زکوٰۃ اور تقسیم دولت: جدید معاشیات کے پیداوار کی روز افزوں ترقی کے لیے اس کی منصفانہ اور مساوی تقسیم نہایت ضروری ہے یعنی پیداوار کے عمل میں حصہ لینے والے ہر عامل کو اس کی خدمت کے بقدر پیداوار سے حصہ مل جائے۔ کوشش یہ ہوتی ہے کہ پیداوار کے عوامل کو ان کی شراکت داری اور تعاون کے بقدر حصہ مل جائے۔ گویا جس نے پیداوار کے عمل میں جتنا تعاون دیا اسی حساب سے کل آمدنی میں اس کا حصہ مقرر کیا جائے گا لیکن اس حصے کا تعین حقیقی ذرائع نہ کر کے غیر حقیقی مثلاً آجر اور سرمایہ دار مل کر کرتے ہیں اور اپنا حصہ زیادہ رکھ کر مزدور اور زمین جیسے حقیقی پیداواری ذرائع کا کم حصہ مقرر کیا جاتا ہے اور اس طرح غیر منصفانہ تقسیم کا عمل شروع ہوتا ہے۔

اسلام میں دولت کو جمع کرنے کے بجائے اسے خرچ کرنے پر زور دیا گیا ہے اور دولت یا آمدنی کے خرچ کرنے میں ہی پیداواری عوامل متحرک ہوتے ہیں اور پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ دولت جتنی زیادہ مرتکز (accumulate) ہوگی معیشت میں اتنی ہی زیادہ سستی اور بے روزگاری میں اضافہ ہوگا کیونکہ دولت مندوں کی قوت صرف کم ہوتی ہے اسی لیے جمع دولت کو سودی قرض کے ذریعے سوسائٹی میں پھیلا دیا جاتا ہے تاکہ عوام کی قوت خرید کو بڑھایا جائے اور جمع کی ہوئی دولت پر سود بھی ملتا رہے۔

مسلم معاشرے کے اندر دولت و آمدنی کو زکوٰۃ و صدقات کے ذریعے خرچ کرتے رہنے کا ایک خاص مزاج پایا جاتا ہے جس سے آمدنی مستقل متحرک ہوتی رہتی ہے اور پیداوار میں اضافے کی بنیاد بنتی ہے۔ نظام زکوٰۃ و صدقات تقسیم دولت کا ایک آفاقی نظام ہے جس کی ہمسری کا دعویٰ کوئی دوسرا معاشی نظام نہیں کرسکتا۔ نظام زکوٰۃ تقسیم آمدنی کے وسائل کے اس نظریے اور

معیار کے عین مطابق ہے جس میں پیداوار اور آمدنی میں ان عوامل کو حصہ ملتا ہے جو کسی وجہ سے نظام کے اندر سے اپنا حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ زکوٰۃ تقسیم دولت کے نظام کی بنیاد ہے۔ یہ معیشت کو عدل اور اعتدال کی راہ پر لے آتا ہے اور جس طبقہ یا پیداواری عامل کے پاس زائد از ضرورت دولت پہنچ گئی ہے وہ اسے اللہ کی ایک امانت اور اس پر دوسروں کا حق سمجھ کر دوسرے حقداروں کی ضرورتوں کا کفیل بن جاتا ہے(۱۰)۔ صدقات، زکوٰۃ و خیرات اور انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعہ انسان اپنے نفس اور خواہشات پر قابو پاتا ہے اور حقداروں تک ان کا حق پہنچانے کی ذمہ داری سے بھی عہدہ برآ ہو جاتا ہے اور حق بہ حقدار رسید کے لیے سدا بے چین رہتا ہے(۱۱)۔ زکوٰۃ دراصل ایک عبادت ہے جس کا اصل مقصد تو تزکیۂ نفس ہے لیکن ظاہری مقصد معاشرے میں آمدنی کی منصفانہ تقسیم اور دولت کے ناجائز ارتکاز کو روکنا ہے۔ اس کی غرض و غایت یہ ہے کہ معاشرے میں کم وسائل افراد اپنی معاشی ذمہ داریوں سے نپٹنے میں بے سہارا نہ رہ جائیں اس لیے حکومت یا امیر کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ زکوٰۃ مالدار مسلمانوں سے لے کر غریب مسلمانوں میں تقسیم کر دے۔

اسلام انفرادی ملکیت اور ذاتی صلاحیت کی بنیاد پر آمدنی میں اضافے کو کبھی منع نہیں کرتا لیکن اس اضافی دولت پر دوسروں کے حقوق کی بات اسلام میں کہی گئی ہے اور اسے معاشرے کی فلاح اور اجتماعی بہبود کے لیے ضروری بتایا گیا ہے۔ معاشی عدم مساوات ایک فطری حقیقت ہے جس کو ایک دم سے ختم نہیں کیا جا سکتا لیکن اسی کے ساتھ آمدنی اور وسائل کی منصفانہ تقسیم اور حقداروں تک ان کے حقوق کو پہنچانا بھی ایک ناگزیر عمل ہے جو معیشت کو توازن اور اعتدال کی راہ پر گامزن رکھ سکتا ہے۔ فی الوقت پوری دنیا کے عمومی معاشی مسائل میں وسائل اور آمدنی کی غیر منصفانہ اور ناجائز تقسیم ایک ایسا بنیادی مسئلہ ہے جس کے حل کے لیے ماہرین لگے ہوئے ہیں لیکن جو حل اسلام پیش کرتا ہے اس کو قبول کرنے سے گریزاں ہیں، جس کے تحت تقسیم کے بنیادی اصول عدل، احسان اور ایثار ہیں (۱۲)۔ معاشرے میں ہر آدمی کی صلاحیتیں یکساں نہیں ہوتی اور نہ ہی ہر ایک کو یکساں سازگار حالات اور ماحول ملتا ہے اس کے باعث تمام لوگوں کی آمدنی بھی یکساں نہیں ہوتی اس لیے زکوٰۃ، صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے زیادہ آمدنی والے طبقے کے پاس جو زائد از ضرورت دولت پہنچ گئی ہے وہ قانوناً اگرچہ اس کی ملکیت ضرور ہے لیکن اسے ایک امانت سمجھتے

ہوئے اس امانت کو اس کے جائز حقداروں تک پہنچانے کا اسے پابند بنایا گیا ہے۔

اسلام کا نظام معیشت پورے اسلام کا ایک جز ہے اور اس کے پورے محاسن اور ثمرات کو اسی وقت زیادہ بہتر طریقے سے حاصل کیا جا سکتا ہے جبکہ یہ پورے اسلامی نظام کے ساتھ نافذ العمل ہو۔ انسان کے اندر اس کے نفاذ کے لیے اخلاقی اور روحانی طاقت اسی وقت زیادہ شدت کے ساتھ بیدار ہوگی جب پورا معاشرہ اسلامی نظام کے تابع ہو، فکر آخرت کا تصور جاگزیں ہو، انسان اپنے ہر عمل کو اللہ کے سامنے جواب دہ تصور کرے اور اپنی ہر دولت اور آمدنی پر دوسرے حقداروں کے حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی ادائیگی کے لیے ہمہ وقت تیار رہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر اسلام کے معاشی نظام کو اس کے اخلاقی، معاشرتی اور روحانی نظام سے الگ کر کے صرف ایک نظریے اور نظام کے طور پر ہی دیکھا جائے تب بھی یہ موجودہ معاشی مسائل کے حل اور اقتصادی نظام کو معتدل، مستحکم اور متوازن رکھنے کے لیے دوسرے تمام نظریات اور نظاموں سے بہتر اور موزوں ترین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب بعض مغربی مفکرین اور دانشور یورپ اور امریکہ وغیرہ میں اسلام کے معاشی اصولوں پر کھل کر بحث کر رہے ہیں اور اس کی خوبیوں خاص طور پر غیر سودی نظام کو معاشی استحکام کے لیے نہایت اہم متبادل کے طور پر تسلیم کیے جانے کی ضرورت کو سمجھ رہے ہیں۔

حواشی

(1)Y.S.Brenner and other,"Income distribution in Historical Perspective" Cambridge University Press (CUP) cambridge,1991,pp9 -11.

(2) P.A. Samuelson & WD Nordhaus ''capital interest and profit'' in ECONOMICS McGraw Hill international 13th Ed 1989, pp717-720.

(3)ibid.

(4) Robert R. Farrell "America's Banking Crisis" The Real Truth, vol 12, No 2, February 2014. (www.realtruth,org/articles)

(5) Khalid, M. ''Two decades of Economic reforms: The Energing Scenaris'' M M University Journal of management prachess, vol 5, No1, 2011, Ambala, India, p5.

(6) Paul Bairoch,, "Economics and world History" University of chicago Press, 1995.

(7) Robert R. Farrell. op-eit.

(۸) مولانا صدرالدین اصلاحی ''اسلامی نظام معیشت''، ص ۲۰، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ (۹) مولانا صدرالدین اصلاحی ''اسلام اور اجتماعیت''، ص ۴۲، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ (۱۰) مولانا صدرالدین اصلاحی ''اسلام ایک نظر میں''، ص ۸۳، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔

(۱۱) یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ صلاحیت اور ہنر (abilities & skills) میں فرق ایک قدرتی امر ہے اور اسی بنیاد پر آمدنی اور دولت میں فرق بھی قدرتی ہے لیکن یہ بات یقیناً وضاحت طلب ہے کہ صلاحیت اور آمدنی میں فرق کا آپس میں تعلق کیا ہے؟ ایک جائزے کے مطابق انسانوں کی قدرتی صلاحیت مثلاً دماغی صلاحیت اور جسمانی قوت وغیرہ میں فرق عام انسانوں میں زیادہ سے زیادہ اور ایک اور تین کا ہوسکتا ہے لیکن آمدنی اور دولت میں یہ فرق (۱:۱۰۰) اور ۱۰۰ تک کا ہوسکتا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے P.A. Samelson. op.eit p 6490۔

(12) Naceur, Tabnoun, "Islam and Manegement" International Islamic Publishing House (IIPH), Riyadh 2007, pp 340-345.

اخبار علمیہ

''انٹرنیٹ پر اسلامی انسائیکلوپیڈیا''

''دی ترکش ریلیجیس افیرس فاؤنڈیشن'' نے اپنی ویب سائٹ پر ۴۴ جلدوں پر مشتمل اسلامی انسائیکلوپیڈیا پیش کردی ہے، خیال ہے کہ یہ عہد حاضر کی اسلامی معلومات کا سب سے اہم اور مستند ماخذ ہے، ۱۹۸۳ء میں اس کا آغاز ہوا تھا اور ۱۹۸۸ء میں اس کی پہلی جلد منظر عام پر آئی تھی، سائنس، تاریخ، جغرافیہ اور اسلامی تہذیب و تمدن کا ۱۵ ہزار ۲۲۶ عناوین کے تحت احاطہ کیا گیا ہے، تقریباً ۵ سو مستند ماخذ کے اس میں حوالے ہیں، ۱۶ ہزار ۸۵۵ ذیلی عناوین اور سرخیاں قائم کی گئی ہیں، اس کی تیاری میں ۲ ہزار سے زیادہ علماء و محققین کا تعاون رہا، اس میں مراکش سے انڈونیشیا تک تمام مسلم ملکوں کے سماجی معلومات کے ساتھ ساتھ غیر مسلم ملکوں کی مسلم اقلیت کے متعلق بھی اطلاعات ہیں۔ رپورٹ کے مطابق پہلی جلد ۱۲، دوسری اور تیسری نو اور سات مہینے میں مکمل ہوئی پھر اس عمل میں تیزی آئی اور بقیہ جلدیں چھ چھ مہینے میں پایۂ تکمیل کو پہنچی، اس کی آخری جلد دسمبر ۱۳ء میں تمام ہوئی، ہالک کنونشن سینٹر میں اس کی تعارفی تقریب منعقد کی گئی جس میں وزیر اعظم طیب اردگان کے علاوہ متعدد وزراء اور اعیان ملک شریک ہوئے۔ (ملی گزٹ، ۱۶-۳۱/ مئی ۱۴ء، ص ۲۱)

''جوانا نائٹس دی پلینیٹ''

جرمن ماہرین نے اس نام سے ایک افسانوی کتاب انسانی بال پر تحریر کی ہے، یہ بارہ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں ایک ایسی لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے جو بنائی کر کے مختلف اشیاء کو نئی شکل دیتی ہے، ان میں درختوں سے لے کر موسیقی کے آلات تک شامل ہیں۔ انتہائی جدید ٹیکنالوجی سے تیار کی جانے والی اس کتاب کو خوردبین کے بغیر پڑھنا تو دور کی بات ہے دیکھنا بھی ممکن نہیں، ۲۷/ جون کو اس کو شہر ہمبرگ میں نمائش کے لیے پیش کیا جائے گا۔ (اخبار مشرق، ۱۲/ مئی ۱۴ء)

''کفو جانچ کی مقبولیت''

عموماً عورتیں اپنے ہونے والے شوہر کے نام، تعلیم اور عہدہ کے علاوہ مزید کسی اور معلومات سے واقف نہیں ہو پاتیں، جس کے سبب بعد میں ازدواجی زندگی میں انہیں متعدد مسائل کا

سامنا کرنا پڑتا ہے۔ایک خبر کے مطابق نکاح کے بعد ممکنہ پیش آمدہ مسائل کے حل اور ایک دوسرے کے عادات واطوار اور چال چلن سے واقف ہونے کے مقصد سے سعودی عرب میں ''کفاء ٹسٹ'' یعنی لازمی ازدواجی معائنہ کو بڑی تیزی سے مقبولیت مل رہی ہے،عنود الزمل کا کہنا ہے کہ اس کے ذریعہ شادی سے پہلے اس اہم معاملہ کے متعلق رجحانات کا اندازہ ہوجاتا ہے،شہزادی نورہ بنت عبدالرحمٰن الفیصل سوشل سنٹر میں عائلی مشاورتی یونٹ کی سربراہ بدیعہ الراشدی نے اس کی وکالت کرتے ہوئے کہا کہ اس سے زوجین کے درمیان پیدا ہونے والے مسائل سے بچنے میں مدد اور ایسی معلومات سے آگاہی ہوتی ہے جن کے بارے میں عموماً دونوں لاعلم رہتے ہیں۔تاہم خبر میں اس ٹسٹ کی قانونی وشرعی حیثیت کے متعلق کوئی رائے نہیں دی گئی ہے۔(سعودی گزٹ،انگریزی روزنامہ،۳۰؍مئی ۱۴ء)

''ممنوعات سے متنازع مضر کیمیائی مادہ کا اخراج''

پھلوں کے ذائقہ والے مشروبات میں بی وی او (برومین وجیٹیبل آئل) بطور اضافی جز استعمال کیا جاتا ہے جس کے متعلق میوکلینک کے طبی محققوں کا کہنا ہے کہ اس کے مستقل استعمال سے صحت پر مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں،اس کے بعد گذشتہ برس کوکا کولا کی حریف کمپنی پیپسی نے اپنے اسپورٹس مشروبات سے اس کیمیائی مادہ کو ہٹا دیا تھا اور کہا تھا کہ اپنے تمام مشروبات سے اس کے استعمال کو ختم کرنے کا اس کا وسیع منصوبہ ہے،خبر ہے کہ اب کوکا کولا کمپنی بھی اس سال کے آخر تک اپنے مشروبات فینٹا اور پاورایڈ سے اس متنازع کیمیائی مادہ کو نکال دے گی،اس کے ترجمان نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ انہوں نے یہ فیصلہ آن لائن پٹیشن کی وجہ سے کیا ہے نہ کہ حفظان صحت کے مسئلہ کے سبب۔اس لیے کہ ہمارے تمام مشروبات جن میں بی وی او شامل ہے محفوظ ہیں اور ہمیشہ محفوظ ہے رہیں گے اور جن ممالک میں ان کی فروخت کی جارہی ہے،وہ وہاں کے ضابطوں کے مطابق ہے۔(بی بی سی اردو ڈاٹ کام،۶؍مئی ۱۴ء،منگل)

''ٹیپو سلطان کی انگوٹھی کی نیلامی''

ہندوستان کی مشہور ریاست میسور کے بادشاہ ٹیپو سلطان کا شماروطن عزیز کے لیے غیرملکوں

کے خلاف لڑنے والے جاں بازوں میں ہوتا ہے، ۱۷۹۹ء میں ایک برطانوی فوجی کمانڈر نے ٹیپو کی شہادت کے بعد ان کی انگلی سے انگوٹھی اتار لی تھی، جس کا وزن ۴۱ء۲ گرام ہے اور اس پر ''رام'' نام کندہ ہے، ۲۰۱۲ء میں اس کی نیلامی کا جب اعلان کیا گیا تھا تو اس پر روک لگا دی گئی تھی، مگر اب خبر ہے کہ لندن کے نیلام گھر کرسٹیز میں ایک لاکھ ۴۵ ہزار پاؤنڈ میں اس کو فروخت کر دیا گیا ہے لیکن خریدار کا نام ظاہر نہیں کیا گیا ہے، انگوٹھی کے تعارف میں لکھا گیا تھا ''یہ بات حیران کن ہے کہ ایک مسلمان حکمران ہندو مذہب کے دیوتا کے نام والی انگوٹھی پہنتے تھے''۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں ہندوؤں سے ہمدردی و خیر سگالی کے جذبات موجزن تھے، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز کے پروفیسر ایس، سیتار کا کہنا ہے کہ اگر یہ انگوٹھی کسی نجی شخص کو فروخت کی گئی تو عوام اس سے محروم ہو جائیں گے، انہوں نے حکومت سے درخواست کی ہے کہ وہ قانونی اور سفارتی اثر و رسوخ کا استعمال کر کے انگوٹھی واپس حاصل کرے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ہندوستان کے متمول افراد کو اس کے خریدنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ٹیپو سلطان یونائیٹڈ فرنٹ نامی تنظیم نے بھی حکومت سے یہی درخواست کی ہے۔ (بی بی سی اردو ڈاٹ کام، ۲۳ رمئی ۱۴ء)

''بینتھم نامی گاؤں کی فروخت''

برطانیہ کے جنوبی مغربی علاقے ڈیون شائر میں ایک ساحلی گاؤں ''بینتھم'' کے مالک نے پورے گاؤں کو ایک کروڑ ۱۵ لاکھ پاؤنڈ میں فروخت کرنے کا فیصلہ کیا ہے، ۱۷۵۰ ایکڑ اراضی پر مشتمل اس گاؤں میں ۴۰ مکانات، ایک شراب خانہ، دکان اور ایک چھوٹی بندرگاہ بھی شامل ہے، گذشتہ سال گاؤں کے باشندوں کو اس کی اطلاع دی گئی تھی، مقامی لوگوں نے اس فیصلہ پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے کہا ہے کہ انہیں نہیں معلوم کہ نئے مالکان انہیں رہنے دیں گے کہ نہیں، ممکن ہے اس کو سیاحوں کے لیے مخصوص کر دیا جائے، ایک مقامی کرایہ دار نے امید ظاہر کی ہے کہ اس کو برطانیہ کا نیشنل ٹرسٹ خریدے گا جو برطانیہ کے تاریخی اور خوبصورت مقامات کی حفاظت اور دیکھ ریکھ کرنے والا ادارہ ہے۔ (تفصیلات بی بی سی اردو ڈاٹ کام، ۲۳ رمئی ۱۴ء کی اشاعت میں دیکھی جاسکتی ہیں)

ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

پروفیسر محمود الٰہی

۲۰ رمئی ۲۰۱۴ء

مدیر محترم ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف مئی ۱۴ء میں جناب محمود الٰہی کے ذکر نے میری بھی کچھ یادیں تازہ کردیں، جب میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بی ایڈ کرنے کے لیے نصراللہ ہوسٹل کے کمرہ نمبر ''زیرو'' میں رہتا تھا (یہ کمرہ نمبر ''زیرو'' پوری یونیورسٹی میں صرف ایک تھا) تو میرے ساتھ میرے ایک دوست شفاعت صاحب بھی رہتے تھے۔ان سے ملنے جناب محمود الٰہی زخمیؔ بھی کبھی کبھار آجاتے تھے۔اس وقت محمود الٰہی زخمیؔ قصیدہ جیسے مشکل عنوان پر پی ایچ ڈی کررہے تھے، اس طرح ان سے میری ملاقات بھی ہوجاتی تھی ۔ میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی ایڈ اور ایم ایڈ کے امتحانات پاس کرلیے اور پھر میرا تقرر شبلی نیشنل کالج کے بی ایڈ سیکشن میں ہوگیا۔ میں نے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے آگرہ سے ایل ایل بی بھی کرلیا پھر گورکھپور یونیورسٹی سے اردو سے ایم اے بھی کرلیا۔اردو کے وائیوا کے لیے گیان چند جین آئے تب ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب گورکھپور یونیورسٹی کے اردو شعبہ کے صدر کی حیثیت سے تھے مگر اب زخمیؔ ان کے نام سے غائب تھا، میں نے اکیلے میں ان سے پوچھا ''کیا بھئی اب زخم مندمل ہوگیا ہے'' اس پر وہ ہنسے۔ میں نے سمجھ لیا کہ اب انہوں نے اس لفظ زخمیؔ کو اپنے نام سے الگ کردیا ہے۔صدر شعبہ کی حیثیت سے انہوں نے ٹھیک ہی کیا۔آپ نے لکھا ہے کہ محمود الٰہی صاحب اکثر دارالمصنّفین میں آتے تھے مجھے افسوس ہے کہ آپ کو معلوم نہیں تھا کہ میرے اور محمود الٰہی صاحب کے تعلقات کتنے دیرینہ تھے ۔ایک وجہ یہ بھی تھی میں شبلی اکیڈمی میں منتظم کی حیثیت سے تھا اور میرا آفس لائبریری سے دور تھا، جس کی وجہ سے جناب محمود الٰہی صاحب کی آمد کی مجھے خبر نہیں ہوپاتی تھی ۔اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے وہ بڑے متواضع ،ملنسار اور احباب نواز انسان تھے۔

ناچیز

عبدالمنان ہلالی

مطبوعات جدیدہ

اسلامی ثقافت اور ندوۃ العلماء: از مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۶۴، قیمت ۱۸۰ روپے، پتہ: مکتبہ فردوس، مکارم نگر، لکھنؤ، مکتبہ ندویہ، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور لکھنؤ کے دیگر مکتبے۔

ثقافت کا لفظ آج کسی معاشرہ کی زندگی کے ان پہلوؤں کی جانب اشارہ کرتا ہے جن کا تعلق زندگی گزارنے کے طور طریق، آداب و رسوم اور سب سے بڑھ کر اس معاشرہ کے طرز فکر سے ہے۔ اس طرح تہذیب، تمدن اور ثقافت گویا ہم معنی الفاظ و تعبیرات یا مترادفات ہیں، زیر نظر کتاب کے فاضل مصنف کی نظر سے بظاہر یکساں مفہوم کے حامل الفاظ کا فرق پوشیدہ نہیں، انہوں نے اصل بحث سے پہلے ہی اس فرق کو یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ ثقافت علمی نظریات وخیالات وتصورات سے عبارت ہے جبکہ تہذیب کی اصطلاح، عملی تجربات وترقیات کو شامل ہے۔ قوموں اور مذہبوں کی کثرت نے ثقافتوں کو بھی رنگارنگی اور بوقلمونی دی ہے۔ اس کتاب کے عنوان کا جزو اول اسلامی ثقافت ہے، جس کے متعلق یقین سے کہا گیا کہ اس کا سرچشمہ قرآن وحدیث ہے، علمی نظریات و تصورات کا کامل ظہور، اسلام کے ان ہی دو سرچشموں سے ہوا جو ہر زمانہ کے مطلوب تقاضوں سے اس طرح ہم آہنگ ہیں کہ ان میں فرسودگی اور بوسیدگی کا وہ احساس ہی نہیں جو دوسری قوموں اور مذہبوں کے قدیم و جدید کو تسلسل کی جگہ تضاد وانحراف کے مقام پر لا کھڑا کرتا ہے، اسلام کے اسی امتیاز کو جاننے اور اس کی اہمیت کو تسلیم کرانے میں تحریک ندوۃ العلماء اور اس کے عملی ترجمان دارالعلوم ندوۃ العلماء نے ابتدائے قیام سے اب تک جو کوششیں کی ہیں، اس کتاب میں جائزہ اور تجزیہ کے طور پر ان پر گفتگو کی گئی ہے۔ ندوہ کا روز اول سے یہی عقیدہ ہے کہ اسلامی علوم ومعارف زندہ و پائندہ حقیقت ہیں، اس لیے ہر دور کے تقاضوں اور رجحانوں اور ذہنوں کے مطابق ان علوم کی اشاعت دراصل اسلامی ثقافت کے نقوش کے اثرات وثمرات کو عام کرنے کا فریضہ ہے، یہ عین فطرت انسانی کے مطابق ہے، اس لیے وہ تعلیمی نصاب کی اصلاح ہو یا افکار ونظریات کی جدید شکل میں پیش کش ہو، علم وذوق کو جدت کی لذت سے ہم آہنگ کر کے زندگی اور معاشرہ کی صالحیت وسالمیت برقرار رکھنا اسلامی ثقافت کی خدمت ہے ندوۃ العلماء نے جس خوبی سے اس فریضہ کو ادا کیا وہ ایک زندہ حقیقت ہے، اس کتاب میں اسی سچائی کو مدلل انداز میں پیش کیا گیا ہے اور اس ضرورت کے تحت پیش کیا گیا کہ ندوہ مغربی ثقافت بلکہ تمام مادی ثقافتوں اور تہذیبوں کے سامنے اسلامی تہذیب وثقافت کی خوبیوں کا اعلان اور انتہا پسند مادی نظریات کے

مقابل جامعیت واعتدال کا مظہر ہے، اس اعلان واظہار میں وہ کتنا اور کس طرح کامیاب ہوا، اس کتاب سے ان سوالوں کا جواب تشفی بخش ملتا ہے، فاضل مصنف ندوہ کے ناموفرزند ہیں، ان کی گفتگو میں ادعائیت کی جگہ استدلال ہے اور استدلال میں انصاف ہے، اس لیے یہ کتاب ندوہ والوں کے علاوہ اسلامی ثقافت وتہذیب کی برتری پر یقین رکھنے والوں کے لیے بھی بڑی مفید ہے۔

زاد المتقین فی سلوک طریق الیقین: از حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، ترجمہ ومقدمہ از پروفیسر مسعود انور علوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۳۴۰، قیمت ۱۵۸ روپے، پتہ: مسعود انور علوی، شعبہ عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور کتب خانہ انوریہ، مکیہ شریف، کاکوری، ضلع لکھنؤ، یوپی۔

تاریخ اسلام اور تاریخ ہند پر نظر رکھنے والا شاید ہی کوئی ہو جو شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے محدثانہ و مجددانہ کارناموں سے ناواقف ہو، حدیث کے علاوہ فقہ، سیر وتذکرہ، تاریخ، منطق، صرف ونحو، اخلاق واعمال و عقائد میں ان کی قلم حق رقم سے متعدد تصانیف ورسائل کا ذکر ملتا ہے، تاہم حدیث شریف کے بعد زیادہ کتابیں فن تصوف میں ہیں۔ زیرنظر کتاب تذکرہ وتصوف دونوں کا مجموعہ ہے، گیارہویں صدی ہجری کے آغاز میں شیخ محدث دہلوی نے حج کے سفر میں شیخ عبدالوہاب متقی کی زیارت کی اور ان کے فیوض و برکات سے ان کے نور وولایت کی شہادت دی، یہ کتاب اسی شہادت کی تحریری شکل ہے جس میں شیخ عبدالوہاب متقی اور ان کے پیرومرشد حضرت شیخ علی متقی کے احوال وکوائف ہیں، حرمین شریفین میں مقیم بعض اور مشائخ کے احوال اس پر مستزاد ہیں، تذکرہ صوفیہ میں جن مقامات ومراحل سے صوفی ادب کے قاری آشنا ہیں، یہ کتاب بھی ان ہی کیفیات پر مشتمل ہے، مثلاً شیخ محمد بنوفری کے احوال میں شیخ محدث دہلوی نے مشاہدہ کیا کہ وہ نوافل اتنی جلد ادا فرماتے کہ دوسرے کو صرف بسم اللہ پڑھنے کی توفیق ہوتی، جبکہ شیخ ان نوافل میں سورہ فاتحہ کے ساتھ ایک کی جگہ کبھی کبھی دو دو سورتیں ملاتے، استفسار سے عقدہ کھلا کہ "شاید زمانہ کے قبض وبسط سمیٹنے، پھیلانے کی وجہ سے پڑھتے ہوں گے" شیخ دہلویؒ کے والد نے سکرات کے عالم میں فرمایا کہ اس وقت باغ، نہریں اور بخارا کے سادات کا مشاہدہ کررہا ہوں، خود شیخ دہلوی نے حروف تہجی کو جانے بغیر دو تین مہینوں میں پورا قرآن مجید پڑھ لیا، یہ تمام احوال آج اس حسرت میں اضافہ کرتے ہیں کہ کاش وہی دن پھر لوٹ آئیں جہاں سیاسی قوت وحکومت مغلوں کی سی اور دینی شوکت وسطوت اولیاء کی سی ہو، اصل کتاب فارسی میں ہے، فاضل مترجم نے بڑی روانی اور شگفتگی سے اس کو اردو میں منتقل کیا، بقول مترجم ترجمہ تو ایک اور ہو چکا تھا لیکن اس کی خبر ان کو بڑی تاخیر سے ملی، اس ترجمہ اول کی بعض فروگذاشتوں کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ ع ـ ص

رسید کتب

۱۔ **انحراف (قطعات کا مجموعہ)**، یعقوب تصور، پوسٹ بکس نمبر ۴۶۲۸، یو اے ای اردو آشیانہ/ ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، وارانسی۔ قیمت: ۲۰۰ روپے

۲۔ **تخلیق کی دہلیز پر (تنقید)**، فاروق اعظمی قاسمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ قیمت: ۲۵۰ روپے

۳۔ **دوران سخن**، اعجاز صدیقی مرحوم، مرتبہ افتخار امام صدیقی، مکتبہ قصر الادب ۲۰۲/۲۲۸، دیناتھ بلڈنگ، تیسرا منزلہ، روم نمبر ۱۲، پی بی مارگ، ممبئی۔ قیمت: ۲۰۰ روپے

۴۔ **سخن وران سخن**، اخلاق احمد، البلاغ پبلیکیشن، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ قیمت: ۱۰۰ روپے

۵۔ **سرسید کے مذہبی عقائد و افکار۔ ایک مکالمہ**، ترتیب وتدوین خوشتر نورانی، مکتبہ جام نور ۴۲۲ مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی۔ قیمت: ۷۰ روپے

۶۔ **عرفان شبلی**، کلیم صفات اصلاحی، دار المصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ/ البدر بک سینٹر، مہاجنی ٹولہ سرائے میر، اعظم گڑھ۔ قیمت: ۲۵۰ روپے

۷۔ **علامہ فضل حق خیر آبادی چند عنوانات**، خوشتر نورانی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ قیمت: ۹۱ روپے

۸۔ **قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل**، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ۔ قیمت: ۲۵۰ روپے

۹۔ **قرائے عظام اور ان کی علمی ودینی خدمات**، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، رحمت نگر، پورہ غلامی (عقب آواس وکاس کالونی) اعظم گڑھ۔ قیمت: ۱۰۰ روپے

۱۰۔ **محفل قرآن (جلد سوم)**، مولانا عتیق الرحمن سنبھلی، الفرقان بکڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ۔ قیمت: ۳۵۰ روپے

۱۱۔ **مولانا شبلی کی اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ**، محمد حامد ہلال اعظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدرآباد، ادبی دائرہ، اعظم گڑھ۔ قیمت: ۲۵۰ روپے

۱۲۔ **نگارشات رشحات قلم ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی**، مرتب مولانا نعیم الاسلام قادری، کمال بکڈپو جامعہ شمس العلوم، گھوسی، مئو۔ قیمت: ۲۵۰ روپے